جدید اردو ناول

اسلوب و فن

مصنف

شاعر علی شاعر

جدید اُردو ناول

اُسلوب و فن

مصنف

شاعر علی شاعر

عکس
AKSPUBLICATIONS

کتاب	جدید اُردو ناول......اسلوب و فن
مصنف	شاعر علی شاعر
صفحات	160
سن طباعت	2019ء
قیمت	400
تعداد	500

AKSPUBLICATIONS
Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

Scanned by CamScanner

عبداللہ حُسین کے نام

فہرست

مضامین

◆◆◆

مقدمہ

ایک اہم ادبی کاوش

اے خیام

ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا جب کہا جاتا تھا کہ اُردو میں ناول لکھے ہی کتنے گئے ہیں، ان کی تعداد تو بس اتنی ہے کہ انگلیوں پر گنی جا سکیں۔ لیکن یہ قصہ پارینہ ہو چکا اور اگر کوئی اسی بات پر مُصر ہے کہ اُردو ناول کی تعداد بس اتنی ہے کہ انگلیوں پر گنی جا سکیں تو وہ عصری مطالعے سے غافل ہے اور اس طرح کی تنقید محض تنقید ہے جس کی کوئی اساس نہیں اور بقول شمس الرحمٰن فاروقی کہ:

''تنقید تو چار دن کی چاندنی ہے (اگر اسے چاندنی کا لقب دیا جا سکے)۔
کم ہی تنقیدیں ایسی ہیں جو اشاعت کے دس پندرہ سال بعد بھی پڑھی جاتی ہوں۔ پڑھی جاتی کیا، جانی بھی جاتی ہوں تو بڑی بات ہے۔ درسی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے، ہم کسی نقاد یا کسی تنقیدی کتاب کو اہمیت دے لیتے ہیں لیکن درس کی دنیا کے باہر بھی بہت بڑی دنیا ہے۔ اس دنیا میں ادب پڑھنے والے بہت ہیں اور ان کی تعداد پر اس بات سے کوئی اثر نہیں پڑتا کہ کسی نقاد، مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی نے کسی افسانہ نگار مثلاً انتظار حسین یا قرۃ العین حیدر کے بارے میں کیا رائے ظاہر کی ہے؟''

فاروقی صاحب نے مزید کہا ہے کہ:

''بات یہ ہے کہ آپ لوگ نقاد کو جو اہمیت دیتے ہیں (یا دینا چاہتے ہیں) وہ بچارا اس کا اہل ہے ہی نہیں۔ یہ سب ادبی اور سماجی سیاست کے گورکھ دھندے ہیں۔ آپ لوگوں نے نقادوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے (یا کر دینا چاہتے ہیں) کہ مصنف کی تقدیر کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ طالب علموں کے امتحان کے نتیجے کا فیصلہ کچھ نقادوں کے ہاتھ میں ہو، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

لیکن من وعن ان باتوں پر یقین کرنے میں تامل ہوسکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک کے دور میں اُردو افسانوں کو بے حد فروغ حاصل ہوا، اور وہ دور اُردو افسانہ نگاری کا سنہری دور کہا جاتا ہے اور بجا طور پر کہا جاتا ہے۔ اس دور میں اُردو افسانوں اور افسانہ نگاروں کو ناقدین کی سرپرستی حاصل تھی اور انھوں نے اس کی مقبولیت اور فروغ میں بجا طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن ناولوں اور ناول نگاروں کو اس حد تک ناقدین کی سرپرستی یا مطالعے، تجزیے کی 'سہولت' میسر نہیں رہی اور اس کا بڑا سبب بہت واضح ہے، یعنی مطالعے سے گریز، وقت کی کمی اور غور وفکر کی کمی ہے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر عوامل ہو سکتے ہیں۔ اب جب کہ ناول لکھے جارہے ہیں، بڑی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں تو قارئین کی سہولت کے لیے تنقیدیں بڑی مقدار میں لکھی جانی چاہییں۔

ناول کے بارے میں بات کرنے سے پہلے یہ بات ذہن میں واضح رہنی چاہیے کہ ناول آخر ہے کیا؟ بطور صنف اس کی کیا ضرورت ہے؟ کیا لوازمات ہیں جو کسی تحریر کو ناول بناتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ صنف اُردو میں آئی کہاں سے؟ کیونکہ اُردو کی اکثر اصناف دوسری زبانوں سے ہی اُردو میں راہ پا گئی ہیں یا ان کے مطالعے نے ہماری اصناف کو تقویت اور توانائی بخشی ہے۔

جس طرح افسانے کی کوئی تعریف متعین نہیں کی جا سکتی اسی طرح ناول کے بارے میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ لیکن جس طرح ہم کسی تحریر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ افسانہ ہے یا افسانہ نہیں ہے، یعنی ہم سمجھتے تو ہیں کہ افسانہ کیا ہے لیکن اس کی تعریف کے لیے چند جملے ناکافی ہو سکتے ہیں۔ ناول کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اکثر ناقدین اور ناول نگاروں ں نے اس کی کوئی حتمی تعریف نہیں کی لیکن یہ سمجھنے میں ضرور معاونت کی ہے کہ ناول آخر ہے کیا۔

ڈی ایچ لارنس نے لکھا ہے کہ:

''میں ایک ناول نگار ہوں اور ایک ناول نگار کے بطور میں خود کو کسی بھی اولیا سے، کسی بھی سائنس داں سے، کسی بھی فلسفی سے اور کسی بھی شاعر سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ یہ سب زندہ انسان کے مختلف اجزا کے عظیم ماہر ہیں مگر ان اجزا کی سالم صورت کا ادراک نہیں رکھتے۔

ناول ہی ایک روشن کتابِ زندگی ہے۔ کتابیں زندگی نہیں ہوتیں، محض خلائے اثیر میں تھرتھراہٹیں ہوتی ہیں۔ مگر ناول بطور ایک تھرتھراہٹ کے سالم زندہ بشر کو لرزش میں لا سکتا ہے جو کہ شاعری، فلسفہ، سائنس یا کسی اور کتابی تھرتھراہٹ سے بڑھ کر ہے۔''

یہ ایک بڑے ناول نگار اور نقاد کی باتیں ہیں۔ لیکن ذرا آگے کی۔ پہلے اپنی زبان کے حوالے سے کچھ باتیں کر لینی چاہئیں۔ اُردو میں اس کا چلن کس طرح ہوا، اور کس طرح اس نے ناول کی شکل اختیار کی۔ ہمارے یہاں قصہ گوئی، کہانیاں سنانا اور داستان گوئی ہماری روایت اور ہماری دل چسپی کا حصہ رہی ہیں۔ داستانوں کی مضبوط روایت اور دیگر زبانوں خصوصاً مغربی زبانوں کے ادب نے ہمارے لکھنے والوں کو خاصا متاثر کیا۔ اساطیر اور دیومالائی کرداروں اور قصوں کے علاوہ دینی اور مذہبی افکار اور دل چسپی کے عناصر سے مملو ''قصص القرآن'' کے اثرات نے بھی مہمیز کیا اور یہ تمام چیزیں ناول نگاری کی ریاضت میں کام آئیں۔ پھر عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی زبان کے فن پارے اُردو میں اس طرح منتقل ہوئے کہ یہ مقامی قصے محسوس کیے جانے لگے اور یہ فورٹ ولیم کالج کا بڑا مستحسن اقدام ثابت ہوا۔ اس سے آگے بڑھیں تو کئی اعتبار سے ادب میں بھی تبدیلیاں در آتی محسوس ہوں گی۔ مثلاً سر سید احمد خاں نے افادہ ادب کی بنیاد ڈالی۔ ڈپٹی نذیر احمد ان کے تعلیمی نظریات سے متاثر تھے، سوانھوں نے سر سید کے اصلاحی پروگرام کی تکمیل کے لیے قصے کہانیوں کو ہی وسیلہ بنایا اور ''توبۃ النصوح''، ''ابن الوقت''، ''فسانۂ مبتلا''، ''رویائے صادقہ'' جیسی تصانیف ظہور میں آئیں البتہ ''مراۃ العروس اور ''بنات النعش'' الگ صفات کے حامل ناول ہیں۔

رتن ناتھ سرشار کا ''فسانۂ آزاد'' بھی اسی قبیل کی تحریر ہے، ان کے یہاں توانائی زیادہ ہے اور کردار کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ وہ جاودانی حیثیت اختیار کر جاتا ہے، مثلاً خوجی کا کردار بھلائے نہیں بھولتا۔ راشد الخیری، منشی سجاد حسین، الطاف حسین حالؔی، ریاض خیر آبادی، شاد عظیم آبادی، آغا شاعر دہلوی، بیخود دہلوی اور بہت سے نام ایسے آتے ہیں۔ فیاض علی کے دو ناول ''شمیم'' اور ''انور'' بہت مشہور ہوئے۔ یہاں ایک بات بہت دلچسپ ہے کہ غلام عباس، شاد عظیم آبادی کے ناول ''صورت الخیال'' کو اُردو کا پہلا ناول قرار دیتے تھے۔

کسی نہ کسی شکل میں قصہ نگاری کا تسلسل جاری رہا لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں قصہ

نگاری ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ مرزا ہادی رسوا اور پریم چند نے ناول نگاری میں جدید اختراعی رنگ بھر دیا۔ اُردو ناول اب تک جس طرح رواں دواں تھا، اس کے تصور کو تبدیل کر دیا۔ رسوا نے کئی ناول لکھے لیکن ''امراؤ جان ادا'' میں ایک نئی تکنیک استعمال کی گئی یعنی ایک کردار کی زبانی واقعات بیان کیے گئے جب کہ اس سے پہلے ناول بیانیہ انداز کے ہوا کرتے تھے۔ پریم چند نے اپنے نظریے کی ترویج کے لیے ناول کا فارم منتخب کیا تو کئی ناولوں میں اصلاحی پہلو نمایاں ہوئے اور اپنی ناول نگاری کے آخری دور میں ''غبن'' اور ''گؤدان'' جیسے دیرپا تاثر کے ناول لکھے جو فنی طور پر اور تاریخی طور پر بھی مثال ٹھہرے۔ پریم چند ادب کا ایک تصور رکھتے تھے، ان کا ایک نظریہ تھا جسے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں واضح کیا:

> ''جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہمیں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ ان تحریروں پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشوونما کرتی ہے۔ یہاں یہ جذبات ہیں، وہیں استحکام ہے، زندگی ہے، جہاں ان کا فقدان ہے وہاں افتراق ہے، خود پروری ہے اور نفرت اور دشمنی اور موت ہے۔ اس کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے، یہی اس کا مقصدِ اولیٰ ہے۔''

اسی دور میں کئی اچھے اور عمدہ ناول تحریر کیے گئے۔ کرشن چندر کا ناول ''شکست''، عصمت چغتائی کا ناول ''ٹیڑھی لکیر''، سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات''، عزیز احمد کا ناول ''گریز''، راجندر سنگھ بیدی کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' منظرِ عام پر آئے۔

یوں تو اس دور میں اور بھی ناول نگار سامنے آئے مثلاً نسیم انہونوی، قیسی رام پوری، اے حمید، دت بھارتی، ایم اسلم، رئیس جعفری، صالحہ عابد حسین، حجاب امتیاز علی اور کئی دوسرے لیکن تکنیکی طور پر بھی اور اہمیت کے اعتبار سے بھی عزیز احمد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور سجاد ظہیر نے مثال قائم کی۔ اسی دور میں قرۃ العین حیدر نے یکے بعد دیگرے کئی ناول لکھے اور ان کا ناول ''آگ کا دریا'' ایک سنگِ میل ثابت ہوا۔ ''آخرِ شب کے ہم سفر'' اور ''گردشِ چمن'' اور

بعد میں ''چاندنی بیگم'' کا اضافہ کیا اور کئی مختصر ناولوں کو منظرِ عام پر لا کر اپنی شہرت کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ وارث علوی تو یہاں تک کہہ گزرے کہ:

> ''اگر قرۃ العین حیدر اپنے شان دار ناولوں کو لے کر نہ آتیں تو ہمارے وزن پورے نہ ہوتے۔ عبداللہ حسین اور انتظار حسین نے کچھ اضافہ کیا لیکن پھر مطلع صاف ہو گیا، نئے لکھنے والوں سے افسانہ سنبھل نہیں سکا تو ناول کا کیا ذکر۔''

یہاں ''عبداللہ حسین اور انتظار حسین نے کچھ اضافہ کیا'' اور ''نئے لکھنے والوں سے افسانہ سنبھل نہیں سکا'' محلِ نظر ہے، شاید اس سے آگے وارث علوی کی نظر پہنچنے میں ناکام رہی، ورنہ خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح احمد، حسن منظر، نثار عزیز بٹ، بانو قدسیہ، وحید احمد، الطاف فاطمہ، سلمیٰ اعوان، شمس الرحمٰن فاروقی، مصطفیٰ کریم، حسین الحق، عبدالصمد، جوگندر پال، احسن فاروقی، سید انور، انیس اشفاق، انل ٹھکر، صدیق عالم، اقبال مجید، شموئل احمد، علی امام نقوی، الیاس احمد گدی، قاضی عبدالستار، سید محمد اشرف، صادقہ نواب سحر، رینو بہل اور بہت سے دوسروں کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جنھوں نے ''وزن پورے'' کیے ہیں۔

یہ سارے ناول نگار ناول کے ارتقائی سفر کا فطری عمل ہیں۔ مشرف عالم ذوقی، ناہید سلطان مرزا، سلمان عبدالصمد، پیغام آفاقی، جتیندر بلو، محمد حمید شاہد، مستنصر حسین تارڑ، عاصم بٹ، شفق، خالدہ حسین، غضنفر، ترنم ریاض، حبیب حق، اطہر بیگ، رحمان عباس، محمد امین الدین، طاہرہ اقبال، شمیم منظر، خالد جاوید، نجم الحسن رضوی، شائستہ فاخری و دیگر کے علاوہ حالیہ دنوں میں لکھے جانے والے سید کاشف رضا کا ناول ''چار درویش اور ایک کچھوا'' اور مرزا حامد بیگ کا ناول ''انارکلی'' بڑے معرکے ہیں۔ حامد بیگ اپنا مخصوص تحقیقی مزاج رکھتے ہیں اور تیس سال کی محنت اور تجسس کے بعد انارکلی کے کردار کا تصور ہی بدل کر دکھ دیتے ہیں اور قاری متحیر رہ جاتا ہے۔ دو زمانوں کو، بلکہ کئی زمانوں کو کس طرح مربوط کر دیا جاتا ہے، ایک ہی کڑی میں پرو دیا جاتا ہے، اس کا سلیقہ اور اس کی تکنیک آج کے لکھنے والوں کی گرفت میں ہے۔

مندرجہ بالا ناموں کے بیان سے کئی سوال اُٹھیں گے، اس لیے میں واضح کر دوں کہ نام گنوانے کا میرا ارادہ قطعی نہیں تھا۔ یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ کئی اہم نام رہ گئے ہوں گے، ان کی ترتیب میں بھی تساہلی راہ پا گئی ہے لیکن میرا مقصد صرف ناول کے ارتقائی سفر کو ایک نظر میں سمجھنے اور

ان کی نشان دہی کرنے کی کوشش ہے۔

ہم وہیں لوٹ کر آتے ہیں جہاں سے بات شروع کی تھی، یعنی ناولوں کے انگلیوں پر گننے والی بات۔ اب یہ قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ صفحے کے صفحے ناول نگاروں کے نام سے بھر جائیں اور یہ بھی محض پچیس تیس سالوں کے اندر ہوا ہے۔ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ کسی گروہ یا انجمن نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی ہے کہ ناول لکھے جائیں گے اور بڑی تعداد میں لکھے جائیں گے اور یہ انگلیوں پر گننے والی بات کا دھبہ دھونا پڑے گا۔

لیکن ایسی بات نہیں ہے جب کہ اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ فکشن نگاروں نے، خصوصاً افسانہ نگاروں نے ناول نگاری کی طرف توجہ کی۔ ناول کے فن کو مدِ نظر رکھا، اس کے لوازمات کو سمیٹا اور اپنی روایت سے فائدہ اُٹھایا۔ قصے کہانیوں کا معاملہ تو ان کی گھٹی میں پڑا تھا، جدید علوم سے واقفیت آج کا قصہ ہے، تو یہ توجہ رنگ لائی اور پچیس تیس سالوں میں کئی بہت اچھے ناول منظرِ عام پر آئے۔ اتنے کم عرصے میں ناولوں کی اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر گوپی چند نارنگ کو کہنا پڑا کہ ''اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے۔''

بعض اوقات ذہن میں سوال اُٹھتے ہیں کہ ہم ناول میں کیا پیش کرنا چاہتے ہیں یا یہ کہ ہم ناول میں کیا ڈھونڈتے ہیں۔ ناول کا زندگی سے کیا تعلق ہے۔ ڈی ایچ لارنس کی رائے تو اوپر پیش کر دی گئی ہے، کچھ آرا اُردو کے ناقدین کی بھی دیکھ لیں:

کلیم الدین احمد رقم طراز ہیں:

''ناول انسانی تجربوں کے امکانات کا پتا لگاتا ہے، شعور کے نہاں خانوں کو ٹٹولتا ہے۔ جذبات، خیالات کی پیچیدہ تاریک اور دشوار گزار راہوں کو منور کرتا ہے، فرد اور سماج کے تعلقات کی نازک گتھیوں کو سلجھاتا ہے، حیات و کائنات کی آمادہ گہرائیوں میں غوطہ لگاتا ہے۔''

گویا ناول کا کینوس اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس میں سب کچھ سما جاتا ہے، کوئی گوشہ خالی نہیں رہتا، حیات و کائنات کے اسرار کو گویا منکشف کرتا ہے۔ اس فن کے عظیم امکانات ہی نہیں، عظیم مقاصد بھی ہو سکتے ہیں۔

وارث علوی کہتے ہیں:

''ناول کا سب سے اہم کام دریافت ہے، انکشاف ہے، صداقت کی تلاش ہے، حقیقت کی تھاہ پانے کی کوشش ہے۔''

انھوں نے مزید کہا ہے کہ:

''شاعری تو آدھی زمین سے اوپر ہوتی ہے آدھی نیچے۔ ناول خالص زمین کی چیز ہوتا ہے۔''

یعنی ناول کے بارے میں وارث علوی بھی اسی طرح سوچتے ہیں جس طرح کہ لارنس۔

ایک اور ناول نگار پیغام آفاقی کے ذہن میں سوال اُٹھا تھا، وہ یہ کہ:

''آپ ناولوں میں کیا ڈھونڈتے ہیں؟ دانش وروں کی روش یا محض نئے خیال کی سنسنی؟''

اس سوال کا جواب ہمیں سید محمد عقیل کی اس تحریر میں ملتا ہے:

''قصہ یا واقعہ لیتے وقت یہ سمجھتے رہنا چاہیے کہ ان کا گھیرا کتنا ہے۔ اگر واقعہ یا قصہ عالمی اثر انگیزی نہیں رکھتا یا انسانوں کی زندگی کے اہم مسئلوں کو یہ واقعہ نہیں چھوتا یا کسی انسانی تہذیب یا مسئلہ یا بحران کا مظہر نہیں بنتا تو ایسا قصہ اپنی اہمیت منوا نہیں سکتا۔ خواہ فنکار نے اس پر کتنی ہی محنت کیوں نہ کی ہو۔''

ایک اور ناول نگار اور صفِ اوّل کے افسانہ نگار اقبال مجید کی رائے بھی سن لیجیے:

''ناول نگار جس طرح اپنی مرضی سے اپنے ناول کے کرداروں کو جس وقت بھی جدھر چاہتا ہے ہنکا لیتا ہے، اس طرح وہ اپنے ذہن اور باذوق قاری کو نہیں ہنکا سکتا۔''

کچھ چیدہ چیدہ باتیں اوپر درج کی گئی ہیں جو ممکن ہے ناول نگاری کے فن کو سرسری طور پر ہی سہی، سمجھنے میں معاون ہوں، تنقید یا مقدمہ لکھنا میرا منصب نہیں، میں ناول پڑھتا ہوں تو اپنے لطف و انبساط کے لیے، ناولوں کے حصول کے لیے تگ و دو کرتا ہوں، دیگر ممالک میں شائع ہونے والے ناولوں کو بھی کسی طرح حاصل کر لیتا ہوں۔ شاعر علی شاعر نے میرے ذوق و شوق اور رجحان کو دیکھتے ہوئے شاید محسوس کیا کہ انھیں مجھ سے اپنی کتاب ''جدید اُردو ناول...... اُسلوب و فن'' کے لیے لکھوانا کارآمد ہوگا۔ اوپر درج کی گئی باتیں شاعر علی شاعر کا مسودہ پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں آئیں۔

جب اتنی بڑی تعداد میں ناول لکھے جا رہے ہیں تو یہ بھی ضروری ہے کہ بڑے پیمانے پر تنقیدی تحریریں بھی سامنے آئیں۔ شاعر علی شاعر نے ایک ایک ناول کا تجزیہ نہیں لکھا بلکہ مجموعی طور پر جدید اُردو ناولوں کا اُسلوبیاتی اور فنی مطالعہ پیش کیا ہے۔ لیکن جدید اُردو ناول کے بارے میں لکھتے ہوئے اس کے پس منظر کو بھی پیش کرنا لازمی تھا، سوانھوں نے اُردو ناول کے آغاز اور اس کے ارتقا سے بھی بحث کی ہے۔ صنفِ ادب کے طور پر ناول کو سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے اور اس کی وسعت بھی زیرِ بحث لائے ہیں۔ ناول کے فن پر لکھتے ہوئے انھوں نے ناول کے اجزائے ترکیبی پر بھی قلم اُٹھایا ہے یعنی پلاٹ، کردار، پس منظر، نقطۂ نگاہ اور اُسلوبِ بیان وغیرہ۔ فنی طور پر ناول کے کیا لوازمات ہوتے ہیں، اس کے لیے انھوں نے مغربی مفکرین کے نظریے بھی پیش کیے ہیں۔ انھوں نے نئی صدی میں اُردو ناول کے پاکستان کے حوالے سے اور ہندوستان کے حوالے سے الگ الگ ابواب قائم کیے ہیں۔

جس طرح افسانہ نگاروں کو شکایت رہی ہے کہ ناقدین ان کی طرف توجہ نہیں دیتے، اسی طرح ناول نگاروں کو بھی بجا شکایت ہے کہ ناقدین اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس کی بڑی وجہ تو سہل پسندی ہی ہوسکتی ہے۔ اتنا کچھ پڑھنے کے لیے وقت بھی درکار ہے اور وسائل بھی۔ شاعر علی شاعر نے ناول اور اس کی تنقید پر بھی خامہ فرسائی کی ہے، اُردو ناول کی موجودہ صورتِ حال اور اکیسویں صدی میں اُردو ناول کا کیا کردار ہے اور اُردو ناول کی ترقی یافتہ شکل پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ ان تمام باتوں کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں تھا، لیکن ناول یا اس کے فن اور اُسلوب پر شاعر علی شاعر نے پہلی بار قلم اُٹھایا ہے تو یہ اتنا سرسری بھی نہیں ہے۔ خاصی تحقیق اور محنت درکار تھی جو انھوں نے کی ہے۔ گزشتہ سولہ سترہ برسوں میں تقریباً ایک سو چالیس ناول لکھے گئے ہیں جن میں کئی بہت اہم ناول ہیں جو بہرطور اُردو ناول کی مقدار میں خوش گوار اضافہ ہیں۔

اتنی بڑی تعداد کے مدِنظر قمر رئیس نے لکھا ہے کہ:

"......اُردو ناول اُفقی طود پر آگے بڑھا ہے اور اپنے عہد کی زندگی میں ہونے والی تیز رو تبدیلیوں کے عرفان سے بھی وہ دور نہیں ہوا ہے۔

دراصل یہی وہ پہلو ہے جو اس قدر افزائی کا جواز بنتا ہے ورنہ ناول میں اُسلوب و اظہار کے تجربے اپنے آپ میں کسی مثبت فنی خوبی کا اشاریہ نہیں بنتے۔"

یہ بات لائقِ تحسین ہے کہ اس دور میں لکھے جانے والے اُردو ناولوں کی گونج بھی چہار سو سنائی دینے لگی ہے۔ چند سال پہلے قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کی گونج تو نوبل پرائز کے ایوان میں بھی سنائی دی تھی۔ ایسے میں شاعر علی شاعر کی یہ کتاب "جدید اُردو ناول...... اُسلوب و فن" ایک اہم ادبی کاوش گردانے جانے کی مستحق ہے۔ ان سے اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس صنف پر مزید توجہ دیں گے اور ان کی مزید کاوشیں منظرِ عام پر آئیں گی۔

◆◆◆

میری تنقیدی کوشش

شاعر علی شاعر

یہ حقیقت ہے کہ اُردو ادب میں شاعری کے بعد سب سے زیادہ فکشن لکھا جا رہا ہے۔ فکشن میں بھی اوّل نمبر پر افسانہ اور دوسرے پر نمبر پر ناول ہے۔ جہاں ناول مغربی ادب کی ایک اہم اور مقبول صنف ہے وہاں اُردو ناول کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بیس ویں صدی کے اُردو ناول نگاروں کی کوششوں سے پاکستان و ہندوستان میں اُردو ناول نے بڑی تیزی اور خوب صورتی سے ارتقائی منازل طے کی ہیں اور آج اکیس ویں صدی میں یہ اپنے فن کی معراج کو پہنچنے والا ہے بلکہ اب تو اُردو ناول کے دنیا کی کئی زبانوں میں تراجم کیے جانے سے اس کا شمار عالمی ادب میں بھی ہونے لگا ہے۔ اُردو ناول کو متعدد بڑے ناول نگار میسر آنے سے اس کی شہرت کا گراف بلند ہوا ہے اور عالمی سطح پر اس کی طرف توجہ مبذول ہوئی ہے۔ پاکستان و ہندوستان اور اُردو کی نئی بستیوں میں بھی اُردو ناول کی گونج برقرار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنفِ ادب کو ہمارے یہاں مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہو چکی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُردو ناولوں میں ناول نگاروں کا تخلیقی وفور انسانی جذبات و احساسات، وارداتِ قلبی، نازک احساسات اور تلخ و شیریں تجربات کی بڑے حسین، موثر اور فطری انداز میں ترجمانی کر رہا ہے اور جدید اُردو ناول میں تو فلسفۂ حیات، زندگی کے مختلف پہلو، انسانی رویوں، انسان کے مختلف کردار اور اس کے عمیق مشاہدات کا بھرپور اظہار بھی پایا جا رہا ہے اور اس میں اصلاحِ معاشرہ اور انسانی کردار و اخلاق کے تعمیری پہلو کو بھی مدِ نظر رکھا جا رہا ہے۔ اس لیے اُردو میں اچھے اور معیاری ناول تخلیق ہو رہے ہیں۔

تحقیق کے مطابق اکیس ویں صدی میں 140 کے قریب اُردو ناول شائع ہو چکے ہیں جن کی سن وار ترتیب کچھ یوں ہے:

اکیس ویں صدی میں شائع ہونے والے اُردو ناول

قربتِ محبت میں مرگ	مستنصر حسین تارڑ	2001ء
شیشہ ٹوٹ جائے گا	مقصود الٰہی شیخ	2001ء
پروفیسر ایس کی عجب داستان	مشرف عالم ذوقی	2001ء
عزازیل	یعقوب یاور	2001ء
انیسویں ادھیائے	نند کشور وکرم	2001ء
پکار	مولانا قاسم علوی	2001ء
دائرہ	محمد عاصم بٹ	2001ء
گھر تو آخر اپنا ہے	وحید عزیز	2001ء
بادل	شفق	2002ء
جنگ جاری ہے	احمد صغیر	2002ء
کاغذی گھاٹ	خالدہ حسین	2002ء
مجھ سے کہا ہوتا	آنند لہر	2002ء
گوتم	بلراج ورما	2002ء
میرے نالوں کی گم شدہ آواز	محمد علیم	2002ء
حاصلِ گھات	بانو قدسیہ	2003ء
غمِ دل وحشتِ دل	محمد حسن	2003ء
مہاماری	شموئل احمد	2003ء
کابوس	شفق	2003ء
دی وارجرنلس	صلاح الدین پرویز	2003ء
چارنگ کی کشتی	صدیق عالم	2003ء

اگر تم لوٹ آتے	آچاریہ شوکت خلیل	2003ء
ویرگاتھا	سلیم شہزاد	2003ء
تو اور میں	عباس خاں	2003ء
وشواس گھات	جتیندر بلو	2003ء
پارپرے	جوگندر پال	2004ء
اگنی پریکشا	کشمیری لال ذاکر	2004ء
دھمک	عبدالصمد	2004ء
پوکے مان کی دنیا	مشرف عالم ذوقی	2004ء
فسوں	غضنفر	2004ء
وِش منتھن	غضنفر	2004ء
مورتی	ترنم ریاض	2004ء
نخلستان کی تلاش	رحمان عباس	2004ء
اُسھیر اپگ	ثروت خان	2005ء
اہنکار	نور الحسنین	2005ء
جب گاؤں جاگے	شبر امام	2005ء
میں اور امراؤ جان	عباس خان	2005ء
شہر میں سمندر	شاہد اختر	2005ء
جیون مایا	فارینہ الماس	2005ء
کئی چاند تھے سرِ آسماں	شمس الرحمٰن فاروقی	2005ء
ایک ہزار دو راتیں	صلاح الدین پرویز	2006ء
دروازہ ابھی بند ہے	احمد صغیر	2006ء
رانگ نمبر	مشتاق انجم	2006ء
صدر محترم	اشرف شاد	2006ء
خوابوں کی بیساکھیاں	اتل ٹھکر	2007ء

جاگنگ پارک	نکہت حسن	2007ء
جسے میر کہتے ہیں صاحبو	حبیب حق	2007ء
شوفر	ظفر عدیم	2007ء
شاہین غزالہ	خواجہ محمد یونس	2007ء
نرک	نسیم انجم	2007ء
کہر	محمد الیاس	2007ء
تانیہ	وحید عزیز	2007ء
شوراب	غضنفر	2008ء
ندی	شموئل احمد	2008ء
سڑک سیدھی جاتی ہے	ظفر عدیم	2008ء
یاسمین	ظفر عدیم	2008ء
کہانی کوئی سناؤ متاشا	صادقہ نواب سحر	2008ء
غلام باغ	مرزا اطہر بیگ	2008ء
دھنی بخش کے بیٹے	حسن منظر	2008ء
گہرا زخم	شاعر علی شاعر	2009ء
برف آشنا پرندے	ترنم ریاض	2009ء
ایک ممنوعہ محبت کی کہانی	رحمان عباس	2009ء
جانے کتنے موڑ	آشا پربھات	2009ء
ایک اور کوسی	نسرین ترنم	2009ء
چمن کو چلیے	عبیدہ سمیع الزماں	2009ء
کراچی والے	محمد امین الدین	2009ء
آشوب گاہ	محمد حامد سراج	2009ء
مٹی کی سانجھ	طاہرہ اقبال	2009ء
بکھرے اوراق	عبدالصمد	2010ء

خس و خاشاک زمانے	مستنصر حسین تارڑ	2010ء
پلیتہ	پیغام آفاقی	2010ء
سانپ اور سیڑھیاں	سلیم شہزاد	2010ء
اندھیرے ہونے سے پہلے	نجمہ سہیل	2010ء
سیاہ کاریڈور میں ایلین	جاوید حسن	2010ء
اوٹرم لین	خوشنودہ نیلوفر	2010ء
نرآ کار	عمر فرحت	2010ء
چاند کی کہانی	قمر نقشبند نقوی	2010ء
ہند ایک خواب اور	وسیع بستوی	2010ء
مانجھی	غضنفر	2011ء
لے سانس بھی آہستہ	مشرف عالم ذوقی	2011ء
موت کی کتاب	خالد جاوید	2011ء
خدا کے سائے میں آنکھ مچولی	رحمان عباس	2011ء
زخم	محمد عمر فاروقی	2011ء
کنجری کا پل	یونس جاوید	2011ء
قرطبہ	مصطفیٰ کریم	2011ء
ماروی اور مرجینا	نجم الحسن رضوی	2011ء
رشتے	انل ٹھکر	2012ء
نام دیو	آنند لہر	2012ء
فٹ پاتھ کی زبانی	حبیب کیفی	2012ء
لیسا	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2012ء
سشما	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2012ء
درکتے رشتے	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2012ء
لمحوں کی کسک	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2012ء

Scanned by CamScanner

گلابی پسینہ	نفیس تیاگی	2012ء
زینو	وحید احمد	2012ء
عجب نصیبی	سید ثروت ضحیٰ	2012ء
راجپوت	عبداللہ بیگ	2012ء
سراب منزل	اے خیام	2013ء
شکست کی آواز	عبدالصمد	2013ء
آتشِ رفتہ کا سراغ	مشرف عالم ذوقی	2013ء
نادیدہ بہاروں کے نشاں	شائستہ فاخری	2013ء
ایک بوند اجالا	احمد صغیر	2013ء
لیمی نیٹڈ گرل	احمد صغیر	2013ء
انگوٹھا	ایم مبین	2013ء
ایوانوں کے خوابیدہ چراغ	نورالحسنین	2013ء
زوالِ آدمِ خاکی	محمد غیاث الدین	2013ء
دوسری ہجرت	سرور غزالی	2013ء
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	نشاط پیکر	2013ء
یہ عشق نہیں آساں	وحید عزیز	2013ء
نالۂ شب گیر	مشرف عالم ذوقی	2014ء
گم شدہ شناخت	انل ٹھکر	2014ء
نعمت خانہ	خالد جاوید	2014ء
صدائے عندلیب برشاخِ شب	شائستہ فاخری	2014ء
گلیوں کے لوگ	اقبال حسن خان	2014ء
اوڑھنی	نصرت شمسی	2014ء
پتوار	نسیم انجم	2014ء
اے دلِ آوارہ	شموئل احمد	2015ء

چاند ہم سے باتیں کرتا ہے	نورالحسنین	2015ء
گئودان کے بعد	علی ضامن	2015ء
موت کا سوداگر	شاہ جہاں جعفری حجاب	2015ء
آخری سواریاں	سیّد محمد اشرف	2015ء
گرداب	شموئل احمد	2015ء
آہٹ	نسیم انجم	2015ء
اے جذبۂ دل گر تو چاہے	پروفیسر خیال آفاقی	2015ء
یہ عشق نہیں آساں	وحید عزیز	2015ء
گرداب	سید سعید نقوی	2016ء
جن دن سے	صادقہ نواب سحر	2016ء
چینی جو میٹھی نہ تھی	صفدر زیدی	2016ء
چاند کی سحر	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2016ء
روحزن	رحمان عباس	2016ء
یہ راستہ کوئی اور ہے	اقبال حسن خان	2016ء
میرواہ کی راتیں	رفاقتِ حیات	2016ء
نمائش خانہ	اسد رضا	2016ء
نیلیما	شفق سوپوری	2016ء
نولکھی کوٹھی	علی اکبر ناطق	2016ء
رنگ محل	طاہرا سلم گورا	2016ء
لفظوں کا لہو	سلمان عبدالصمد	2016ء
تلاشِ وجود	اسلم سراج الدین	2016ء
محمد شاہ کا ٹانگہ	علی اکبر ناطق	2017ء
سربازار رقصاں	نسیم انجم	2017ء
ڈیوس اور علی بابا	نعیم بیگ	2017ء

نیلی بار	قرۃ العین طاہرہ	2018
انارکلی	مرزا حامد بیگ	2018
چار درویش اور ایک کچھوا	سید کاشف رضا	2018ء
محبت مر نہیں سکتی	وحید عزیز	2018ء
خواب گاہ	شاعر علی شاعر	2018ء

اس تمام کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اُردو ناول کے فن پر اُردو میں تنقیدی و تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ چند کتابیں مغربی ادب کا ترجمہ ہیں۔ جس قدر ناول لکھے گئے ہیں تنقید ان کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں جو تنقیدی کتابیں لکھی گئیں ان کی فہرست پیشِ خدمت ہے:

ناول کی تنقیدی تاریخ	محمد احسن فاروقی
ناول: فن اور تکنیک	محمد احسن فاروقی
ناول کیا ہے	محمد احسن فاروقی
ناول اور ناول نگار	علی عباس حسینی
ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی
اُردو ناول اور آزادی کے تصورات	پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف
آزادی کے بعد اُردو ناول	ڈاکٹر اسلم آزاد
اُردو کے پندرہ ناول	اسلوب احمد انصاری
ہندو پاک میں اُردو ناول	ڈاکٹر انور پاشا
اُردو ناولوں میں ترقی پسند عناصر	ڈاکٹر حیات افتخار
اُردو ناول میں تصوف کی روایت	ڈاکٹر رضا احمد
اُردو میں تاریخی ناول	ڈاکٹر رشید امجد
اُردو ناول نگاری	سہیل بخاری
اُردو ناول میں طنز و مزاح	شمع افروز زیدی
اُردو ناول آغاز و ارتقا	عظیم الشان صدیقی
قرۃ العین حیدر اور اُردو ناول کا جدید فن	ڈاکٹر عبدالسلام

فنِ ناول نگاری	ڈاکٹر عبدالسلام
اُردو ادب میں عورت کا تصور	فہمیدہ اکبر
اُردو ناول میں سماجی شعور	ڈاکٹر محمد افضال بٹ
اُردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات	ڈاکٹر محمد عظیم اللہ
اُردو ناول کا سفر	ڈاکٹر مظفر عباس
(ہیئت، اسالیب اور رجحانات، ۱۹۴۷-۲۰۰۷ء)	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
اُردو ناول کے بدلتے تناظر	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
ناول کے ہمہ گیر سروکار	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
آزادی کے بعد اُردو ناول	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
اُردو ناول (کرداروں کا حیرت کدہ)	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
اُردو ناول کے چند اہم زاویے	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
اکیس ویں صدی میں اُردو ناول	مرتب: ڈاکٹر نعیم انیس
اُردو ناول: تاریخ و ارتقا (آغاز سے اکیس ویں صدی تک)	ڈاکٹر محمد اشرف کمال
پانچ ناول...... تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد اشرف کمال
برصغیر میں اُردو ناول	ڈاکٹر خالد اشرف
نئی صدی۔ نئے ناول (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)	غفور احمد
پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول	ڈاکٹر نجمہ صدیق
بیس ویں صدی میں اُردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست

یہ سب تنقیدی کتب بہت پرانی ہیں جب کہ ناول اکیس وی صدی میں داخل ہو گیا ہے اور اکیس ویں صدی میں ان سترہ سالوں میں 140 سے زیادہ ناول سامنے آ گئے ہیں۔ ان پر تنقید کون لکھے گا، ان ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ کون کرے گا۔ لہٰذا اس ضمن میں سوچا گیا ہے کہ پہلے ناول کے فن، تکنیک، ناول کے اجزائے ترکیبی، اُسلوبِ بیاں، ناول کی ماہیت، ناول کے نظریات وغیرہ پر بات کی جائے کیوں کہ عالمی سطح پر ناول میں مختلف تغیر و تبدل پیدا ہو چکا ہے۔ متعدد تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ اس کا نقطۂ نظر، مقاصد اور لفظیات بدل چکی ہیں۔ اس کا کینوس بھی

وسعت پذیر ہو گیا ہے۔ سائنسی ترقی کے زیرِ اثر اس میں نئے نئے موضوعات کو برتا جا رہا ہے۔ معاشرے میں بدلتے ہوئے حالات اور جدید رجحانات کے تحت لکھا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ اکیس ویں صدی کے ناول اور ناول نگاری کے فن کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور اس کے تمام لوازمات پر سیر حاصل گفتگو کی جائے۔ اس سے جہاں ناول نگار، ناول کے نقاد، محقق اور طلبا استفادہ کریں گے وہاں قارئین بھی فیض یاب ہو سکیں گے۔

◆◆◆

مضامین

اُردو ناول کا آغاز وارتقا

اُردو ناول کی عمر زیادہ نہیں۔ 1857ء کے غدر کے بعد کشیدہ صورتِ حال پیدا ہوئی اور ہندوستانی خصوصاً مسلمان طبقے کو اس غدر کا موردِ الزام ٹھہرا گیا تو ان پر رزق و روزگار کے دروازے بند کردیے گئے۔کاروبار ختم کرادیے گئے۔ملازمتوں پر پابندی عائد کردی گئی، ہرطرح سے ان کا معاشی قتلِ عام کیا گیا تو ان میں مایوسی، انتشار اور بے روزگاری پھیل گئی۔ ہر شخص ان ناساعد حالات میں غیرآسودہ زندگی سے تنگ آ گیا تھا مگر کیا کرتا۔تمام راہیں مسدود کردی گئی تھیں۔تعلیم کے حقوق بھی سلب کرلیے گئے تھےاور کاروبار ٹھپ کرادیے گئے تھے۔مسلمانوں کو یہ سزائیں غدر کا الزام لگا کردی گئی تھیں جب کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو اور سکھوں کو سراہا گیا۔انہیں نہ صرف سرکاری ملازمتیں دی گئیں بلکہ کاروبار کے مواقع بھی فراہم کیے گئے۔ان پر تعلیم کی راہیں بھی کشادہ کردی گئیں اور ترقی کے مواقع بھی فراہم کیے گئے۔اس متعصبانہ ماحول اور ناسازگار حالات نے مسلمانوں کو گوشہ نشین ہونے پر مجبور کردیا۔وہ ایک دوسرے سے گفتگو کرکے اپنا وقت گزارنے لگے۔ یہی گفتگو، واقعات، قصے، کہانیاں، کتھا اور داستان گوئی میں تبدیل ہوگئی۔ ہر شخص نت نئے موضوع پر نہ صرف کہانی سنانے لگا بلکہ مایوس افراد بڑی دل چسپی سے سننے بھی لگے۔ یہ کہانی طول پکڑتی گئی اور داستان کی صورت اختیار کرگئی۔ایک داستان گو اپنے ذہن سے کہانی گھڑتا اور بیسیوں لوگ سنتے۔وہ داستان میں چاشنی، دل چسپی اور تجسس پیدا کرنے کے لیےاپنے ذہن کی تمام صلاحیتیں بروئے کارلاتا اور داستان کو نئے نئے موڑ پر لاکر ختم کرتا۔سامعین آئندہ اس کی کہانی سننے کے لیے دوسرے روز کا بے چینی سے انتظار کرتے۔ان داستانوں میں عشقیہ، پُرتجسس، رزمیہ اور ماورائی مخلوق کی کہانیاں شامل ہوتی تھیں۔

دوسری طرف ڈراما نگاروں نے اس طرف توجہ کی تو وہ اچھی کہانیوں پر ڈرامے لکھنے لگے۔

امانت لکھنوی اور آغا حشر کاشمیری کے اسٹیج ڈرامے ناقابلِ فراموش ٹھہرے، تیسری طرف شاعر حضرات نے مثنویوں میں ان کہانیوں کو منظوم پیش کرنا شروع کیا تو وہ منظوم داستانوں کا روپ اختیار کرگئیں۔ کئی کئی سو اشعار پر مشتمل مثنویاں آج بھی اُردو ادب کا حصہ ہیں جن میں ''گلزارِ نسیم''، ''زہرِ عشق'' اور'' سحر البیان'' مشہور ومعروف اور اُردو ادب کی شاہ کار مثنویاں ہیں جو صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی تر وتازہ ہیں اور اپنی زبان و بیان اور عظمتِ شاعرانہ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب داستانوں، مثنویوں اور ڈراموں کا رواج عام ہوا تو ان اُردو نثر نگاروں کی توجہ مغربی صنفِ ادب ناول کی جانب مبذول ہوئی جو انہیں داستان کے قریب تر لگا۔ پہلے پہل انگریزی ناولوں کے اُردو تراجم ہوئے جو پسند کیے گئے۔ داستانیں چوں کہ طویل ترین ہوتی تھیں لہٰذا اُردو نثار نے ناول کے لوازمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مغربی طرز پر اُردو ناول لکھنا شروع کیے۔ یہ عاشقانہ، ماورائی مخلوق کا بیان اور رزمیہ واقعات فکشن کی صورت پیش کیے جانے لگے تو ان میں مزید دل چسپی اور رنگینی پیدا ہوگئی جس طرح ہیرے کو تراشنے کے بعد اس کی آب وتاب اور خوب صورتی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ہیرا کہلائے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ اسی طرح داستان کو ناول کے روپ میں پیش کرنے پر اس کے عناصرِ ترکیبی کا پیکر عطا کرنے کے بعد ایک نئی چیز سامنے آئی جو قبول صورت بھی تھی اور پُر اثر و دل چسپ بھی۔ لہٰذا مثنویاں، ڈرامے اور قدیم داستانیں دم توڑنے لگیں، ان کی جگہ افسانے، ناولٹ اور ناول نے لے لی۔ اس لیے اُردو ناول کو قدر کی نگاہ سے دیکھا، اور شوق سے پڑھا جانے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ اُردو ادب کا دامن اچھے اور معیاری فکشن سے مالا مال ہوگیا۔ یہ اُردو ناول ڈپٹی نذیر احمد، قرۃ العین حیدر، مرزا ہادی رسوا، منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو، سلطان حیدر جوش وغیرہ کی محنت کا ثمرہ ہے۔

ناول کی وسعت پذیری:

یہ حقیقت ہے کہ اُردو ناول میں دیگر اصنافِ نثر سے زیادہ وسعت ہے۔ اس کا کینوس رزمیہ شاعری اور ڈرامے کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے کیوں کہ اس میں نئے موضوعات، جدید خیالات، بیان کی ندرت، اسالیب اظہار اور متعدد کرداروں کو ایک ساتھ پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس میں ناول نگار اپنے تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، نازک

احساسات اور شدید جذبات کو بڑے آسان اور مؤثر پیرائے میں بیان کرسکتا ہے۔ انسان اور اس کی زندگی کے نشیب وفراز کی داستان کو سمویا جاسکتا ہے۔ انسان کے مختلف کردار اور اخلاق کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ انسانی زندگی کی فطرت کی ترجمانی ناول میں ممکن ہے۔ انسان کے مختلف رویوں کی بہترین عکاسی ناول میں بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ بلکہ اب تو اُردو ناول کا دامن اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ اس میں رومانی، تاریخی، سماجی، سیاسی، معاشی، ادبی، ثقافتی، اقتصادی اور عمرانی پہلوؤں پر بھی افسانوی انداز میں بحث کی جاسکتی ہے کیوں کہ ناول ہماری ساری زندگی کی عکاسی بھی کرتا ہے اور زندگی کی مختلف زاویوں سے تصویر کشی بھی۔ یہ انسان کا مکمل اور بھرپور مطالعہ کرتا ہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی بھی۔ یہ اپنے زمانے کی دستاویز بھی ہوتا ہے اور اس زمانے کی تہذیب وثقافت اور حکومت و سیاست کی تاریخ بھی۔ یہ انسان سے متعلق اس کی خواہشات، ارمان، خواب، ضروریات، اس کی دنیا، پیار، محبت، عشق، خوشی، غم، احساسات، جذبات، مشاہدات، شکست وریخت، مایوسی اور موت کا خوف بھی کچھ اس کے دائرے میں آتے ہیں۔

ناول بہ حیثیت صنفِ ادب:

ناول کہنے کو تو ایک صنفِ ادب ہے مگر اس نے ڈراما، شاعری، تنقید، رپورتاژ، سوانح عمری، سرگزشت، مصوری، موسیقی جیسے تمام فنونِ لطیفہ سے استفادہ کیا ہے۔ مگر ناول کو ناول بنانے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے کسی ایک موضوع کو مرکز بنا کر لکھا جائے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ اگر کوئی مصور تمام رنگوں کی مدد سے اپنے برش کو کاغذ پر چاروں طرف پھیرتا رہے تو کبھی بھی کوئی قابلِ دید تصویر نہیں بن سکے گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مصور کے ذہن میں بنائے جانے والی تصویر کا ایک خاکہ موجود ہو، اور اس نے ہر زاویے سے اس خاکے پر ذہنی صلاحیت مرکوز کر رکھی ہو، پھر وہ اپنے برش کو ماہرانہ انداز میں حرکت دے گا تو اس کے ذہن پر نقش تصویر کا خاکہ کاغذ پر مجسم ہوتا رہے گا اور بہت جلد ایک خوب صورت اور خوش نما تصویر اس کاغذ پر پینٹ ہو جائے گی جو قابلِ دید بھی ہوگی اور جاذبِ نظر بھی۔

لہٰذا ہر ناول نگار کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ کس چیز پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور کس کہانی کو کرداروں کے ذریعے بُننا چاہتا ہے۔ اس بات کو ہم یوں بھی پیش کرسکتے ہیں کہ ایک افسانہ نگار

کے سامنے دنیا بھر کی کہانیاں ہوتی ہیں۔اس کی زندگی میں پیش آنے والے مختلف واقعات، تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات اور شدید جذبات ہوتے ہیں لیکن وہ بہ یک وقت سبھی کو بیان نہیں کرسکتا۔تب وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے کس واقعے کو افسانہ بنانا ہے اور وہ فیصلہ کرتا ہے کہ کیا یہ واقعہ اس قدر اہم، ضروری اور اس قابل بھی ہے کہ اسے افسانے کا موضوع بنایا جائے۔

اسی طرح ناول نگار کے سامنے بھی ایک دنیا اور اس کے مافیہا پھیلے ہوئے ہیں۔ پوری کائنات سجی ہوئی ہے، اس کی رنگا رنگی آنکھوں کو خیرہ کررہی ہے، اس تمام جلوہ سامانیوں اور رنگینیوں کے سامنے اسے سوچنا ہوگا کہ وہ کس چیز کو اپنی استعداد، پسند، ضرورت اور مہارت و دل چسپی کے مطابق لکھنا شروع کرتا ہے اور کس طرح ناول کے فن میں ڈھالتا ہے۔ایک اچھا ناول نگار وہی ہوتا ہے جو اپنے کیمرے کو ایک چیز پر فوکس کرتا ہے اور بڑی دل چسپی، توجہ، لگن اور مہارت سے اس کی تصویریں بناتا ہے۔کیمرے کو ایک مرکز پر فوکس کرنے ہی سے اچھی تصویر بن سکے گی۔لہٰذا اچھا ناول نگار زندگی کے کسی ایک پہلو پر قلم اُٹھاتا ہے۔اس کے مطابق کردار چنتا ہے اور ذہن میں موجود کہانی کو الفاظ کی مدد سے صفحۂ قرطاس پر مجسم کرتا جاتا ہے۔جس فن کار کا فن جس قدر پختہ ہوگا اس کی تخلیق اس قدر عمدہ ہوگی۔

جس طرح انسانی امراض لاتعداد ہیں مگر ایک ڈاکٹر کسی ایک مرض کی تشخیص و علاج میں مہارت پیدا کرکے اس مرض کی جلد تشخیص بھی کرتا ہے اور کامیابی سے علاج بھی کرتا ہے۔جس کی وجہ سے مریض صحت یاب ہوجاتا ہے۔اسی طرح ناول نگار کے سامنے بے شمار موضوعات قدم قدم پر بکھرے پڑے ہیں۔مگر ایک ماہر ناول نگار زندگی کے کسی ایک موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے۔ایک تخلیق کار کی انفرادیت یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ان پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے جو انسان کی آنکھ سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔وہ ایسی چیزوں کو اندھیرے سے نکال کر اُجالے میں لاتا ہے تو ہر شخص کو نظر آنے لگتی ہیں۔

داستان اور ناول میں فرق:

داستان کی بنیاد فرضی کرداروں اور من گھڑت واقعات پر رکھی جاتی ہے جس میں محیر العقول باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ایسی باتیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔یہ صرف وقت گزاری

کے لیے بیان کی جاتی تھیں۔ان کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔

ناول کی بنیاد جھوٹ پر نہیں رکھی جاتی۔اس میں معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ہر کہانی کا تعلق آپ سے، آپ کے معاشرتی کردار سے یا آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ضرور ہوتا ہے جو حقیقت میں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی جگہ موجود ہوگا۔ناول ہماری حقیقی زندگی کی عکاسی بھی کرتا ہے اور معاشرہ و سماج کی تصویر کشی بھی۔اسی لیے کہتے ہیں کہ ناول اپنے زمانے کی تاریخ بھی ہوتا ہے اور اس زمانے کی تہذیب و ثقافت اور سیاسی زندگی کا آئینہ بھی۔ناول میں انسان اور اس کی زندگی کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے، انسان کے معاشرے سے باہمی تعلقات کی روداد بھی ناول نگاری ہے۔

اکثر ڈائجسٹ رائٹرز اس بات پر بہ ضد رہتے ہیں کہ ہماری کہانیوں کو بھی ادب میں گردانا جائے کیوں کہ یہ بھی ناول ہیں اور اس میں بھی ناول کے عناصرِ ترکیبی اور لوازمات کو برتا جاتا ہے۔ ان ڈائجسٹ رائٹرز کے گوش گزار کرتا چلوں کہ ڈائجسٹ میں ڈائجسٹ کی ڈیمانڈ کے مطابق لکھنا پڑتا ہے جب کہ ادب میں قلم کار اپنی مرضی و منشا کے مطابق لکھتا ہے۔ڈائجسٹ رائٹرز کے مدِ نظر دولت کمانے کا مقصد ہوتا ہے جب کہ ناول نگار کی تحریر کا مقصد معاشرے کے مسائل کی نشان دہی اور اس معاشرے کی اصلاح ہوتا ہے۔اچھا ناول نگار وہ ہوتا ہے جو مسائل کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ان مسائل کا حل بھی پیش کرے۔

ناول کے موضوعات:

جب ایک عام انسان زندگی اور اس میں رونما ہونے والے واقعات پر نظر ڈالتا ہے تو وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، نازک احساسات اور شدید جذبات کا اظہار چاہتا ہے۔عام انسان کو یہ واقعات دوسروں کو سنا کر اپنے اظہار کی خواہش پوری کرلیتا ہے۔مگر ایک شاعر ان واقعات کو منظوم کرکے شاعرانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ایک مصور تصویر کشی کی مدد سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ایک افسانہ نگار افسانہ بُنتا ہے اور ایک ناول نگار اپنے ناول میں اپنے مشاہدات کو الفاظ کے سہارے صفحۂ قرطاس پر پینٹ کردیتا ہے۔اگر ناول نگار کا موضوع اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہوجائے تو ایک شاہ کار

تحریر سامنے آتی ہے۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں بے شمار موضوعات قدم قدم پر بکھرے پڑے ہیں مگر ہرایک موضوع کو افسانہ نہیں بنایا جاسکتا، نہ ہر کسی موضوع پر ناول لکھا جا سکتا ہے کیوں کہ نہ تو ہمارے یہاں موضوعات کی کمی ہے اور نہ لکھنے والوں کا فقدان ہے،لہٰذا ہر ناول نگار اپنے مزاج کے مطابق موضوع چنتا ہے اور اس پر کماحقہٗ کوشش کر کے قابلِ مطالعہ اور اثر انگیز بناتا ہے۔یہ موضوع کا انتخاب ناول نگار کے رجحان اور طبیعت کی مطابقت سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنا نقطۂ نظر اور مقصد خاص انداز میں بیان کر کے عوام الناس کے سامنے پیش کرتا ہے جو برس ہا برس یاد رکھا جاتا ہے اور زیرِ بحث آتا ہے۔ان موضوعات میں انسان،اس کی زندگی، زندگی کے نشیب وفراز، تلخیاں،خوشیاں،کام یابیاں، ناکامیاں، خاندانی معاملات،ازدواجی زندگی،عشق ومحبت،ہجر وفراق، وصل وملاپ،تڑپ وانتظار،عورت،اور اس کے مختلف روپ اور کردار، رذائلِ اخلاق اور معاشرتی گراوٹ بھی ہوسکتے ہیں اور والدین، بیوی،اولاد،حالاتِ زندگی،رجحانات،خیالات وتصورات،خواہشات،خواب وخیال اور زندگی کی خوشی اور موت کا خوف بھی ہوسکتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان جس طرح اپنی طاقت سے زیادہ وزن نہیں اُٹھا سکتا، یا اپنی قوت سے زائد کام نہیں کرسکتا،اسی طرح کوئی بھی ناول نگار اپنے تجربات اور مشاہدات کے دائرے سے باہر نہیں جاسکتا۔وہ اپنی آنکھوں دیکھا اور گزرا احوال تو بیان کرسکتا ہے مگر اَن دیکھی چیزوں کو بیان نہیں کرسکتا۔اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ان میں نہ تو حقیقت کا رنگ ہوگا نہ چاشنی بلکہ ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ایسی تحریر کو کس صنفِ ادب میں شمار کریں کیوں کہ وہ ناول تو ہو نہیں سکتا۔

متعدد ناول نگار ایسے ہیں جنہوں نے اپنے لیے کوئی موضوع مخصوص کرلیا ہو،اور انہوں نے اس موضوع پر زیادہ ناول تخلیق کیے ہوں۔جیسے منشی پریم چند نے دیہات کے پس منظر میں ناول لکھے۔کسی نے رومانی ناول لکھے اور کسی نے جنسیات کی طرف توجہ دی۔نفسیاتی مسائل پر بھی ناول لکھے گئے۔تاریخی اور مذہبی ناول ان کے علاوہ ہیں۔کچھ ناول نگار برگر فیملی کی کہانیوں کو اپنے ناول کا موضوع بناتے ہیں اور کچھ ناول نگار میڈل کلاس کے مسائل کو۔ابوالفضل صدیقی اور نذرالحسن صدیقی نے اپنی ناول نگاری کی بنیاد جانوروں کی زندگی کو بنایا۔کچھ ناول نگاروں نے

بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں، رئیسوں، رئیس زادوں، امیر وکبیر اشخاص کی کہانیوں کو ناول کا موضوع بنایا۔

جیسے قرۃ العین حیدر نے ایک خاص پس منظر میں ناول لکھے،اسی طرح اکثر ناول نگاروں نے سیاسی،معاشی اور معاشرتی وسماجی مسائل اُجاگر کیے۔اسلامی مسائل کو بھی پیشِ نظر رکھ کر ناول لکھے گئے جیسے شادی بیاہ کی رسومات، نکاح وطلاق کے مسائل،عشق ومحبت کی داستانیں اور حلالہ اور دوسری شادی کے موضوع پر بھی ناول لکھے گئے۔اصلاحِ معاشرہ کے مقاصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے بھی ناول تحریر کیے گئے ہیں۔

یہ ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی موضوع کو سامنے رکھ کر ناول لکھے،ناول نگار کو اپنی توجہ،اپنے مشاہدات، تجربات،محسوسات اور علم کو سامنے رکھ کر ناول نگاری کرنا ہوتی ہے۔اس کا مقصد کسی معاشرے میں برائی کو رواج دینا نہیں ہونا چاہیے،نہ ناول نگار کو کسی عالمِ دین یا مبلغ کی طرح اصلاح کا کام کرنا چاہیے۔اس کا کام زندگی کی مکمل اور بھرپور انداز سے ترجمانی ہے۔تبلیغ و پند ونصائح نہیں اور نہ سماجی برائیوں کے خلاف قاری کو بغاوت پر آمادہ کرنا ہے۔نہ قاری کو جنت کا لالچ دینا ہے اور نہ دوزخ کا خوف دلانا ہے۔یہ کام تو ہمارے علمائے کرام کا ہے۔ناول نگار کے لیے ناول کا موضوع باضابطہ متعین نہیں ہوتا۔یہ موضوع تو ناول نگار کے لیے اس کا تجربہ،مشاہدہ اور احساس عطا کرتا ہے۔

ناول کے اجزائے ترکیبی:

ناول کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ،کردار،پس منظر،اُسلوبِ بیان اور نقطۂ نظر ہے۔ان اجزائے ترکیبی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ناول لکھا جائے تو ناول کے زمرے میں آئے گا وگرنہ وہ افسانہ،طویل افسانہ،کہانی،داستان، کتھا اور ناولٹ تو ہوسکے گا ناول نہیں بن پائے گا۔ایک اچھا ناول نگار مضبوط پلاٹ،عمدہ کردار، جان دار پس منظر،ناول کی اصل تکنیک،مربوط اُسلوبِ بیان اور مدلل نقطۂ نظر لے کر ناول کی بُنت کرتا ہے تو بہت پُراثر اور دل چسپ ناول لکھا جاتا ہے۔آئیے ناول کے اجزائے ترکیبی پر فرداً فرداً تفصیل سے بات کرتے ہیں۔

پلاٹ (Plot)

پلاٹ کسی بھی ناول کی جان ہوتا ہے۔اس لیے اسے ناول کا اہم ترین جز وتسلیم کیا گیا ہے۔ ناول نگار اپنے ناول میں بیان ہونے والے واقعات کو اس طرح مبسوط اور مربوط پیش کرتا ہے جیسے کڑی سے کڑی ملا کر زنجیر بنا دی جاتی ہے۔ واقعات کا دل کش اور خوب صورت تسلسل ہی پلاٹ کہلاتا ہے۔ یہ تسلسل جس قدر مربوط، مبسوط اور تواتر سے لکھا جائے گا اسی قدر اثر انگیز اور قابلِ مطالعہ ہوگا۔ غیر مربوط عبارت سے ایک تو واقعات کا تسلسل ٹوٹ کر قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے، دوسری طرف ناول نگار کی بات ٹھیک طور پر سمجھ نہیں آتی۔ قاری کا ذہن پراگندہ اور منتشر ہونے کی بنا پر تحریر میں چاشنی باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے قاری بوریت محسوس کرتا ہے اور ناول کے مطالعے سے اُکتا جاتا ہے۔ وہ ناول کی قرأت ختم کر دیتا ہے اور اگر بے دلی سے ناول پورا بھی پڑھ لیا جائے تو اس کا اثر قائم نہیں رہے گا۔ ناول نگار کا وہ مقصد فوت ہو جائے گا جس کے تحت اس نے ناول لکھا ہے۔ ناول نگار واقعات کی مربوط ترتیب سے زندگی کی ایک جھلک ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری ناول نگار کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے جس سے تحریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور قاری وہ کچھ دیکھتا ہے جو کچھ ناول نگار دکھانا چاہتا ہے۔ قاری کو وہ معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں جو ناول نگار مہیا کرتا ہے کیوں کہ ناول نگار ناول میں ان مناظر کو بھی پیش کرتا ہے جو قاری کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ قاری کی دل چسپی کا عنصر ہوتا ہے۔اس لیے پلاٹ کو اوّلیت حاصل ہے۔ باقی تمام اجزائے ترکیبی کی حیثیت ثانوی ہے۔ ناول میں واقعات کی ترتیب تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کی جائے تو یہ عمل اینٹ سے اینٹ ملا کر دیوار بنانے کا خیال کیا جاتا ہے جس سے تمام عمارات حسین، عمدہ اور بہترین طرزِ تعمیر کا نمونہ نظر آتی ہیں۔ پرانے زمانے میں کہانیاں، کتھائیں اور داستانیں اس طرز پر لکھی جاتی تھیں چوں کہ ناول نے بھی داستان سے جنم لیا ہے اس لیے اس کی بنیاد میں یہ وصف شامل ہے اور اس نے یہ وصف داستان سے وراثت میں پایا ہے۔

ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ناول میں بیان کردہ بھی واقعات اہم نہیں ہوتے۔ یہ ناول نگار کا فن اور کمال ہوتا ہے کہ وہ جس واقعے کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے اسے بہت جلی اور

عمدہ انداز میں پیش کرتا ہے جس کے اثر سے قاری آخر تک نکل نہیں پاتا۔ ایسے ضروری واقعات کو پلاٹ کی بُنت میں شامل کرنا ناول نگار کے سلیقے اور کمالِ فن کی داد دیتا ہے۔ ناول نگار واقعات کے انتخاب میں مہارت سے کام لے کر ان واقعات کو اُجاگر کرتا ہے جن سے کہانی کے کردار بولڈ ہو کر سامنے آتے ہیں۔ جس ناول میں پلاٹ اور کردار جس قدر باہم مربوط ہوں گے وہ ناول اس قدر متاثر کن اور دل چسپ ہوگا۔ پلاٹ کو کردار سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ہر واقعہ کسی نہ کسی کردار ہی سے سرزد ہونا ہوتا ہے۔ اسی لیے واقعات کو زبان دینے کے لیے کردار کا سہارا لینا ناگزیر ہے کیوں کہ پلاٹ کے لیے جو مواد اکٹھا کیا جاتا ہے وہ زندگی کے نشیب وفراز، اعمال وافعال سے جمع کیا جاتا ہے۔ ان خیالات وتصورات اور اعمال وافعال کو ادا کرانے کے لیے کردار کی اشد ضرورت پیش آتی ہے۔ لہٰذا یہ سوال دم توڑ جاتا ہے کہ ناول کے لیے پلاٹ کو اوّلیت دی جائے یا کردار کو۔

زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے نشیب وفراز کے بے شمار واقعات سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں خوشیاں، غم، رنج والم، آرام وسکون، چین وراحت، انتظار، تڑپ، انتشار، خوف، عشق ومحبت، غصہ ونفرت سبھی عناصر خلط ملط ہوتے ہیں۔ ان کا انتخاب کرنا اور سلیقے سے پیش کرنا اور ترتیب بنائے رکھنا ہی پلاٹ کہلاتا ہے۔ ناول نگار کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اہم واقعات اور غیر اہم واقعات کو علاحدہ علاحدہ رکھے۔ اہم واقعات کی پیش کش ہی قاری کے ذہن کو متحرک رکھتی ہے۔ واقعات کے اس تسلسل اور ان کے ربط ہی سے پلاٹ وجود میں آتا ہے۔

کچھ ناول نگاروں نے کلاسیکی ادب کی تلمیحات سے متاثر ہو کر ناول لکھے ہیں۔ جیسا کہ ''رستم وسہراب'' وغیرہ، مہمات کے ہیرو کو مثالی کردار میں پیش کر کے ناول لکھے گئے ہیں جن کی تعداد اچھی خاصی ہے جیسے ''محمد بن قاسم''، ''ٹیپو سلطان''، ''حیدر علی''، ''ذوالقرنین''، ''مغلیہ بادشاہ'' وغیرہ۔ ہندوستان میں ''رامائن'' اور ''مہا بھارت'' کے قصوں پر مشتمل ناول بھی سامنے آئے ہیں۔ ایران میں بہادر افراد کی کتھاؤں کو بھی ناولوں کے موضوعات بنائے جاتے ہیں۔

ایک اچھا ناول نگار اپنے خیالی خاکے کے مطابق کرداروں کی عمدہ پیش کش سے پلاٹ کی تعمیر کرتا ہے۔ معاشرے میں رونما ہونے والی کہانیوں اور وقوع پذیر واقعات کو اپنے فن کے ذریعے ناول کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ ناول نگار کبھی یہ کوشش نہیں کرتا کہ وہ اپنے ناول کو

بہاروں سے سجا ہوا گلستان بنا کر پیش کرے۔اس میں رنگ برنگے پھول کھلائے،کلیاں چٹکائے،
پھولوں کی مہکی مہکی،بھینی بھینی اور مٹی کی سوندھی خوشبو سے معطر صحنِ گلشن دکھائے،نہ ناول نگار یہ
کوشش کرتا ہے کہ زندگی رنج،الم،دکھ،درد،تکلیف،مصائب،مشکلات،آنسوؤں اور خوف کا پیکر
لگے۔ناول نگار زندگی کے سبھی رخ سامنے لاتا ہے۔ہاں اتنا ضرور ہوتا ہے کہ وہ جس واقعے سے
زیادہ متاثر ہوتا ہے اسے اُجاگر اور اُبھار کر پیش کرتا ہے۔جس قدر واقعات کو باہم مربوط کر کے پیش
کیا جائے گا پلاٹ اتنا ہی مضبوط ہوگا۔ناول میں جھول یا نقص اس وقت پیدا ہوتا ہے جس وقت
غیر ضروری اور غیر اہم واقعات کو نمایاں کیا جائے اور وہ غیر مربوط بھی ہوں۔

پلاٹ کے ضمن میں ہمیں چند باتوں کو بھی مدِ نظر رکھنا ہوتا ہے کہ پلاٹ میں نقطۂ آغاز و
انجام ہونا چاہیے۔واقعات ہم آہنگ ہوں اور ناول کی فضا سے لگا کھاتے ہوں۔بیانات متضاد نہ
ہوں،کردار کمزور نہ ہوں۔ان تمام لوازمات کے ساتھ ساتھ جدید ناول میں اس بات کو سب سے
زیادہ اہمیت دی جاتی ہے انسان اور اس کی زندگی سے متعلق تمام حقائق کا انکشافات کیے جائیں۔
مادیت نے جس قدر انتشار،بے ربطی،ہنگامے اور بے راہ راوی کو جنم دیا ہے اس کا ازالہ پیار،
محبت،ملنساری،اخلاق،روشن خیالی،کشادہ دلی اور روحانیت کے ذریعے ممکن ہے۔

جدید ناول کی تشکیل میں ولن کے کردار سے بھی بدلاؤ آیا ہے۔ناول کے پلاٹ پر بھی یہ ولن
اثر انداز ہوا ہے۔ولن وہ کردار ہے جو برائی پھیلاتا ہے،برے اعمال و افعال کرتا ہے اور شیطانیت
کے پرچار میں پیش پیش رہتا ہے۔اس لیے ولن کو معاشرے میں قدر کی نگاہ سے نہیں بلکہ نفرت کی
نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں ہیرو یعنی مثبت کردار کو پسند کیا جاتا ہے۔لہٰذا ناول
نگار پہلے منفی کردار ولن کو طاقت ور انداز میں پیش کرتا ہے اور ہیرو کو سیدھا سادا پیش کیا جاتا ہے مگر
منطقی اختتام کے لیے دونوں کا ٹکراؤ لازم ہے اور مثبت کردار کی جیت پر قارئین خوشی اور اطمینان
محسوس کرتے ہیں۔

کردار (Character)

ناول میں پلاٹ کے بعد سب سے زیادہ اہمیت کردار کو حاصل ہے کیوں کہ ناول نگار زندگی
کے مختلف نشیب و فراز اور پہلوؤں کو کردار ہی کے ذریعے اُجاگر کرتا ہے بلکہ ناول نگار وہ نقطۂ نظر

بھی کرداروں کے ذریعے ہی سامنے لاتا ہے جس کے تحت ناول لکھا گیا ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے
کہ تخیلات کی پیداوار اور زندگی کے واقعات کا بیان ہی ناول نگاری ہے۔اس لیے کہا گیا ہے کہ
ناول نگاری سیرت نگاری نہیں ہے کیوں کہ سیرت نگاری میں حقائق اور سچ بیانیوں سے کام لیا جاتا
ہے جب کہ ناول میں حقائق کو حسین و جمیل پیرائے میں پیش کرنے کے لیے یعنی زیبِ داستان
کے لیے جھوٹے واقعات کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔مگر ناول جو کہ ایک بڑے کینوس کی چیز ہے اس
کے تمام کرداروں کے نام علاحدہ علاحدہ ہیں،ان کے منصب جدا جدا ہیں۔

ہیرو یا ولن ناول کے پلاٹ کو آگے بڑھانے میں مسلسل پیش قدمی کرتے رہتے ہیں۔یہیں
وہ اپنا اپنا مخصوص کردار ادا کر کے دیگر کرداروں کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔دیگر کردار وقتی
اور بڑے کرداروں کی پیروی میں آگے بڑھتے ہیں۔ان تمام کرداروں ہی سے ناول کی تعمیر ممکن
ہوتی ہے۔کردار چھوٹا ہو یا بڑا،ہر ایک کے رویے،مکالمہ بازی اور جذبات ہمارے دلوں پر نقوش
چھوڑ جاتے ہیں۔ان کے افکار و اعمال متاثر کن ہوتے ہیں جو ہمیں کچھ نہ کچھ منفی یا مثبت سوچ
دے جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کردار ناول نگار کے عمیق مشاہدات سے جنم لیتے ہیں یا پھر اس کے
تخیلات کی پیداوار ہوتے ہیں یا پھر تلخ و شیریں تجربات ان کے سامنے ان کو لے آتے ہیں۔یہی
وجہ ہے کہ ناول نگار آسانی اور عمدگی سے ان کرداروں میں اپنی ذاتی زندگی کے رنگ بھر کر انہیں
رنگین اور دل کش بنا دیتا ہے۔جب قارئین کو حقیقی زندگی اور اس کے آس پاس کا ماحول ناول
میں نظر آتا ہے تو اسے ان واقعات کو سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگتی بلکہ وہ ان کرداروں سے مانوس
ہو چکا ہوتا ہے۔ایسا بھی ہوا ہے کہ ناول نگار نے اپنے کمالِ فن سے ناول کی کہانی،واقعات اور
کرداروں میں ایسی جان ڈال دیتا ہے کہ قارئین یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ کردار واقعی
زندگی سے تعلق رکھتے ہیں یا وہ ناول نگار کے ذہن کی اختراع ہیں یا تخیل کی پیداوار ہیں۔قاری کو یہ
دھوکا اس لیے ہوتا ہے کہ ناول نگار اپنے کرداروں میں جو رنگ بھرتا ہے وہ اس کے مشاہدات کا
رنگ ہوتا ہے اور اس کو پیش آنے والے تجربات کا رنگ ہوتا ہے جو اس قدر پختہ،گہرا اور شوخ ہوتا
ہے کہ ہر کردار کا پیرہن نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ سب ناول نگار کی تخیلی اور تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت
ممکن ہوتا ہے کہ اس کے کرداروں میں انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے کیوں کہ یہی فطرت کا تقاضا بھی

ہے کہ جس انداز سے ناول نگار نے ذہن میں زندگی کی ترجمانی اور زندگی کے واقعات کی عکاسی کا منصوبہ بنایا ہوگا وہ اسی لحاظ سے اپنے کرداروں کا چناؤ اور ان کی نقل و حرکت پیش کرے گا، ان کا حلیہ اسی قسم کا بنائے گا۔ یوں اس کے کردار اچھے فاعل کے پیکر میں ڈھلتے چلے جائیں گے۔ یہ ناول نگار پر منحصر ہے کہ وہ کرداروں کے خارجی پہلوؤں پر زیادہ توجہ مرکوز کرتا ہے یا کہ پھر داخلی کیفیات اور ذہنی واردات کو ترجیح دیتا ہے۔ بہرحال دونوں صورتوں میں ناول تخلیقی ہوگا۔ یہ داخلی کیفیات کردار نگاری کا معیار مقرر کرتی ہیں۔

ہر ناول نگار اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر ناول میں اس کے زمانے کی تاریخ مرتب ہو رہی ہوتی ہے کیوں کہ اکثر کردار اپنے ماحول اور معاشرے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کرداروں کے کچھ پہلو زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور کچھ کے مخفی رہ جاتے ہیں۔ ایک اچھے ناول نگار کی یہ خوبی قابلِ ذکر ہے کہ اس کے کردار انسان اور اس کی عام زندگی سے حد درجہ ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ یہی بات ان کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھر دیتی ہے اور انہیں حقیقت سے قریب تر کر دیتی ہے۔ جس طرح انسان میں نیکی اور بدی ہر دو خصلتیں پائی جاتی ہیں، اسی طرح ناول کے کردار بھی نیکی اور بدی کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو نہ تو فرشتہ بنایا ہے اور نہ شیطان۔ اسے نیکی اور بدی کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس لیے ناول نگار کے لیے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے کردار کو مثبت انداز میں پیش کرتا ہے یا منفی یعنی اسے برائیوں کا مجموعہ دکھاتا ہے یا فرشتہ صفت، یہ ناول نگار کے کرداروں پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مثبت کردار کو ہیرو کے روپ میں اور منفی کردار کو اس کے برعکس یعنی ولن کے روپ میں پیش کر کے اپنے مقاصد حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ ناول نگار تجرید اور علامت سے بھی کام لیتے ہیں اور کچھ اپنے کرداروں کو مبہم کر کے پیش کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کے بارے میں جلد یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ نیکی کا مجسمہ ہیں یا بدی کا پیکر، کبھی وہ فرشتہ صفت نظر آتے ہیں اور کبھی شیطان صفت۔ ناول نگار کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے کردار کو فرشتہ صفت، بھولا بھالا اور سیدھا سادا پیش کرتا ہے مگر آخر میں اس سے بڑا کوئی گناہ گار اور بدمعاش نظر نہیں آتا۔ ناول نگار اپنے کرداروں سے کھیلتا ہے۔ کبھی اپنے کسی کردار کو عام لوگوں سے بہتر کر کے پیش کرتا ہے اور کبھی برے لوگوں سے بھی بدتر دکھاتا ہے۔ مبہم کردار کسی بھی ناول کا مرکزی کردار ہوتا ہے جو قاری کو چونکاتا ہے۔ یہ کردار تجسس

کے انداز میں ناول کو آگے بڑھاتا ہے اور قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے یہی ناول کی کامیابی کا راز ہوتا ہے۔ یہ تجسس قاری اور تحریر کے درمیان ایک خاص تعلق پیدا کرتا ہے اس لیے قاری کو وہ کردار جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔ قاری کو کرداروں کی شکل میں اور ان کے افعال و اعمال اور کردار میں اپنی زندگی، اپنا معاشرہ اور اپنا آپ نظر آتا ہے۔

لہٰذا اس قسم کی تحریر سے قارئین کی دل چسپی اور بڑھ جاتی ہے، ان کا ذوق و شوق ناول کی کہانی میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ ناول نگار کو معاشرے کا نباض خیال کرتے ہیں۔ ایک ایسا نباض جو حاذق طبیب کی طرح نبض دیکھ کر انسان کے امراض کے بارے میں جان لیتا ہے۔ امراض کی تشخیص کر لیتا ہے اور علاج بھی دریافت کر لیتا ہے۔ اسی طرح ناول نگار معاشرے کا نباض ہوتا ہے، اسے معاشرے میں زندگی گزار کر احساس ہوتا ہے کہ معاشرے میں کیا کیا برائیاں جڑ پکڑ چکی ہیں، کیا کیا گناہ جنم لے رہے ہیں اور ان کا علاج کیا ہے۔ ایک اچھا ناول نگار نہ صرف معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ ان مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے کیوں کہ وہ معاشرے کے افراد سے مل جل کر رہتا ہے، انھی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ قدم قدم پر پیش آنے والے واقعات کو نوٹ کرتا ہے۔ تلخ و شیریں تجربات سے سبق سیکھتا ہے اور اپنے عمیق مشاہدات کو تحریر میں سمو دیتا ہے۔ ایک ناول نگار جب اپنی تخلیقی آنکھ سے معاشرے کو دیکھتا ہے تو اس کے مناظر، واقعات، کردار، رسوم و رواج اس کے سامنے ایک مخلوق کی صورت آتے ہیں، ان کی مجسم تصویروں کو وہ ہزار زاویے سے دیکھتا ہے اور ہر ہر پہلو پر اظہار خیال کرتا ہے۔ تب ایک مربوط تحریر سامنے لاتا ہے جو ناول کہلاتی ہے اور اس ناول کی بنیاد کرداروں پر ہوتی ہے۔

پس منظر (Back Ground)

ناول میں پلاٹ، واقعات کے وقوع کی جگہ، کردار کے باہمی تعلقات اور میل جول کی پیش کش پس منظر کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے ناول نگار جب کسی واقعے کو بیان کرتا ہے تو اس کے لیے کسی نہ کسی وقت، لمحہ، عمارت، سڑک، پارک، باغ، ویرانے، دشت و صحرا یا محل کا انتخاب کرتا ہے۔ ناول میں پس منظر، وہ مقام ہوتا ہے جہاں اس کے کردار آپ میں ملاقات کرتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں، میل جول رکھتے ہیں اور باہمی تعلقات نبھاتے ہیں۔ اس میں جغرافیائی حدود کا عمل

دخل ہوتا ہے۔ وہ پس منظر، ہوٹل بھی ہو سکتا ہے اور میدان بھی، ناول نگار اس مقام سے اپنے زاویۂ نگاہ کا آغاز کرتا ہے اور کہانی کا تانا بانا بنتا ہے۔ ایک ذہین ناول نگار اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق اور واقعات کو ترتیب وار بنانے، کام میں لانے کے لیے جن مقامات کا انتخاب کرتا ہے وہ پس منظر کہلاتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض ناول نگار پس منظر سے بھی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے ذریعے کبھی خوش نگاہی پیش کرتے ہیں اور کبھی خوف کی فضا طاری کر دیتے ہیں۔ یہ ناول نگار کی ذہانت اور اس کی ناول نگاری کے مختلف اسالیب اظہار ہوتے ہیں۔ ناول نگار کی ذہانت اس بات سے سامنے آتی ہے کہ وہ پس منظر کے لیے اپنی کہانی کے مطابق مقام کا کیا انتخاب کرتا ہے۔ کہانی کی سچویشن کے مطابق ماحول اور مقام کا تعین کہانی میں جان ڈال دیتا ہے لیکن یہ پس منظر کہانی کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔ کہانی ماورائی مخلوق کی ہے یا مافوق الفطرت واقعات کی، ناول کی فضا رومانی ہے یا کہ پھر ناول سنجیدہ ہے۔ اس کے مطابق ناول کا پس منظر دکھایا جاتا ہے۔ زیادہ تر ناول معاشرتی اور سماجی ہوتے ہیں جن میں زندگی کی رنگارنگی کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو، دکھ درد، رنج والم، مایوسی، ناداری، ناامیدی، بےزاری، ادھورے خواب اور معاشرتی ناہمواریوں کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ زندگی کے حقوق کے انکشافات پر جو ناول مبنی ہوتا ہے وہی ناول کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

پس منظر کی وضاحت میں، ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کرداروں کا تعلق داخلی محرکات سے ہوتا ہے جب کہ پس منظر کے مقامات خارجی ہوتے ہیں۔ یعنی کسی بھی کردار کے جذبات، مشاہدات، احساسات اور تاثرات و محرکات کے اظہار کے لیے مکالموں سے کام لیا جاتا ہے مگر ماحول، آب و ہوا اور کہانی کی فضا کو سمجھانے اور سُجھانے کے لیے جگہ اور مقام کی مدد لینی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی واقعے کو ترتیب سے بیان کرنے کے لیے پہلے مقام کا تعین ضروری ہے۔ جیسے شراب اور شراب نوشی کی سچویشن کے لیے جہاں ایک شرابی کا کردار سامنے لایا جاتا ہے تو اس کردار کے اظہار کے لیے جام، شراب، مینا، پیانہ، شراب خانہ اور ساقی سمیت مقام و جگہ دکھا کر اپنی بات کی وضاحت کرنا پس منظر کہلائے گا۔ پس منظر جس قدر کہانی سے قریب تر ہوتا ہے اور کرداروں سے جس قدر بہتر مطابقت رکھتا ہے وہ ناول میں جان ڈالنے کے مترادف ہے۔ کہانی کے مطابق بہتر پس منظر بیان کرنے کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کا ذہن کسی اور منظر کی طرف نہ بھٹکے بلکہ وہ اسی

بات کو مرکز و محور جانے جس کی طرف ناول نگار نے اس کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ دراصل پس منظر ایک فریم ہے جس میں ہر ناول نگار کو اپنی کہانی، واقعات اور کرداروں کی تصویر Fit کرنا ہوتی ہے۔ جو ناول نگار جس قدر مہارت اور فن کاری سے اس فریم میں تصویر Fit کرے گا وہ ناول اتنا دلچسپ، اثر انگیز اور متاثر کن ہوگا۔ ہر لحاظ سے تخلیق مکمل، متناسب و متوازی ہو تو بہت متاثر کن اور دیرپا اثر رکھنے والی ہوتی ہے۔ ایک اچھا ناول نگار اس بات کا خیال لازمی رکھتا ہے کہ وہ جس ماحول میں زندگی گزار رہا ہے یا وہ جس ماحول کے قارئین کے لیے ناول لکھ رہا ہے اس کے کردار بھی اس ماحول کے پروردہ ہو تو ناول نگار کا یہ عمل سونے پر سہاگہ ہے۔ اس وجہ سے قاری ایسے کرداروں سے بہت جلد مانوس ہو جاتا ہے جو اس کے ماحول سے تعلق رکھتے ہوں جو اس کے معاشرے سے مطابقت رکھتے ہوں یا جن کے ساتھ وہ زندگی بسر کر رہا ہو۔ مثال کے طور پر اگر کہانی کسی دیہاتی شخص اور اس کی زندگی پر مبنی ہے تو ناول نگار کا فرض ہے کہ وہ پس منظر میں دیہات، پگ ڈنڈی، کچے مکانات، سرسبزی و شادابی، فصلیں، کسان، مزدور اور ہل دکھائے تاکہ قاری کا ذہن ایک سرزمین سے پر مرکوز ہو جائے اور وہ اس کو مرکز و محور جان کر کہانی کے ساتھ ساتھ چلے۔ یہ ماحول قاری کا دیکھا ہوا ہوگا تو وہ نہ صرف کہانی سے متاثر ہوگا بلکہ پس منظر سے بھی لطف اندوز ہوگا اور ناول نگار کی ایک ایک بات اسے دیہاتی زندگی کی حقیقی اور سچی تصویر نظر آئے گی جس کا اثر اس کے ذہن و دل و دماغ پر نقش ہوتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ منشی پریم چند کے ناول آج بھی اُردو ادب میں زندہ ہیں اور پڑھے جا رہے ہیں۔ یہی پس منظر اور فکشن کی مہارت احمد ندیم قاسمی نے افسانہ نگاری میں پیش کی ہے۔

پس منظر میں داخلیت اور خارجیت کے عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر کچھ ناول نگار خارجیت کو اہمیت دیتے ہیں اور کچھ داخلیت پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ داخلیت میں کردار کے اندرونی معاملات مثلاً جذبات (غصہ، پیار، خوف، نفرت، محبت)، احساسات اور عمیق مشاہدات کا اظہار ہے جب کہ خارجیت میں مقام اور جگہ کا تعین شامل ہے۔ یہ ناول نگار کی صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ داخلیت کے معاملات سے ناول کی بُنت کرتا ہے یا خارجیت کے عناصر کو بھرپور انداز میں پیش کرتا ہے۔ ناول نگار کے ذہن میں جو خیالات، تصورات اور خوابوں کی دنیا آباد ہوتی ہے وہ اس کو دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہے۔ اب اس دنیا کی تصویر کشی وہ داخلیت کے اظہار سے کرتا ہے یا

خارجیت کے عناصر سے۔ یہ ناول نگار کا ذاتی مسئلہ ہے۔ قاری کو اس سے غرض نہیں کہ ناول نگار نے خارجی معاملات کو اہمیت دی ہے یا داخلی عناصر کو۔ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ ناول نگار ان معاملات میں کام یاب کس حد تک رہا ہے۔ اس کا فن کس حد تک سامنے آ سکا ہے۔ ناول نگار یہاں اپنے شعور سے کام لے کر لاشعور میں آنے والی تمام اشیا کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے مگر ان کی پیش کش ناول نگار کے لیے مشکل ترین مرحلہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی ناول نگار ان کٹھن مراحل سے مہارت اور فن کاری کے ساتھ آسانی سے گزر جاتا ہے تو وہ ایک کام یاب ناول نگار کہلانے کا حق رکھتا ہے اور اس کی تحریر بڑی پُر اثر اور جان دار تصور کی جاتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر ناول نگار داخلیت اور خارجیت دونوں سے کام لیتا ہے۔ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ناول میں واقعات، کردار اور پس منظر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا کہیں داخلیت کے سہارے بات آگے بڑھائی جاتی ہے اور کہیں خارجیت کی مدد سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ کیوں کہ ہمارے ساتھ بھی یہی فطری عمل ہوتا ہے کہ ہم نہ تو ہمیشہ کلی طور پر خارجیت کی رو میں بہتے ہیں اور نہ ہم پر داخلیت سوار رہتی ہے۔ کبھی خارجی عوامل کام آتے ہیں اور کبھی داخلی عناصر۔ کسی ایک کیفیت کی زیادتی ناول کو یکسانیت اور بوریت کا شکار کر دیتی ہے جس سے ناول کی فضا مکدر ہو جاتی ہے۔ یہ ناول کا جھول بھی ہوتا ہے اور ناول نگاری کا نقص بھی۔

نقطۂ نگاہ (Point of View)

ناول کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، کردار اور پس منظر کے بعد نقطۂ نگاہ آتا ہے۔ ناول نگار جن واقعات کے ذریعے اپنے مدعا کو بیان کرتا ہے وہ اس کا نقطۂ نگاہ کہلاتا ہے۔ ہر ناول نگار کا کوئی نہ کوئی نقطۂ نگاہ ضرور ہوتا ہے جس کو مرکز و محور بنا کر اس نے ناول لکھا ہے۔ ناول نگار اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کرداروں کے ذریعے بھی کر سکتا ہے اور کہانی کے ذریعے بھی یا چند اہم اور ضروری واقعات کے بیان سے بھی اس کا نقطۂ نگاہ واضح ہو سکتا ہے۔ اچھا ناول نگار وہ ہے جو اپنے نقطۂ نگاہ کو کرداروں کی حرکات و سکنات اور گفتگو کے ذریعے بیان کرے، یا مختلف واقعات کی روشنی میں اس کا خاکہ اُبھارے یا کسی حادثے اور سانحے کے پس منظر میں اس کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت خود بہ خود ہو سکے۔ ناول نگار کرداروں کو اس طرح پیش کرے کہ قاری کو کردار کی شکل میں اپنے

آپ کا گمان ہو، یا کم از کم وہ کردار اس کے اپنے معاشرے کا ایک چلتا پھرتا کردار معلوم ہو، جس سے وہ مانوس ہو سکے۔ اس مانوسیت میں قاری کہانی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور کہانی کا لطف اُٹھاتا ہے۔ کسی ناول نگار کی یہی خاصیت اور خوبی اسے دوسرے ہم عصر ناول نگاروں سے منفرد و ممتاز کرتی ہے اور ناول کا یہی کمالِ فن اس کے کام آتا ہے۔

کچھ ناول نگاروں نے ناول کے ذریعے اپنے مقاصد بھی حاصل کیے ہیں کیوں کہ کچھ ناول نگاروں نے سیاسی مقاصد اور مذہبی مقاصد کے حصول کے لیے بھی ناول لکھے ہیں۔ تہذیبی و ثقافتی نقطہ ہائے نظر کے تحت بھی ناول لکھے گئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ناول معاشرے کی اصلاح اور سماج کی فلاح و بہبود کے لیے بھی لکھے جاتے ہیں۔ ناول نگار اپنے سیاسی نقطہ ہائے نظر کو ناول کے ذریعے پیش کر سکتا ہے۔ کئی ناول نگاروں نے اخلاقی نقطہ ہائے نظر کو بھی ناول میں سمویا ہے لیکن ان کا انداز کچھ ایسا تھا یہ ان کا نقطۂ نگاہ کہانی کے تانے بانے میں اس طرح ضم ہو گیا کہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ ناول سے کوئی الگ چیز ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اخلاقی نقطہ ہائے نظر کے ضمن میں آتے ہیں۔ ناول نگار کا یہ اخلاقی فلسفہ اس کے مذہبی عقائد اور اخلاقی تصورات اور اس کے معاشرے کی مذہبی رسومات و رواج پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایسے ناول کے کرداروں میں نیکی و بدی اچھائی اور برائی، خیر و شر، رحمٰن و شیطان، روحانیت و شیطانیت اور بہتری و بدتری شامل ہوتے ہیں جن کو اچھائی کی صورت میں جنت اور برائی کی صورت میں جہنم میں داخل کیا جاتا ہے۔

اخلاقی نقطۂ نظر کی بنیاد پر لکھے گئے ناولوں پر اعتراض بھی ہوا، اور تنقید بھی کی گئی۔ ناقدین کا کہنا تھا کہ معاشرے کی اصلاح، اخلاق کی درستگی اور کردار کی تعمیر ہونی چاہیے مگر ایسے ناولوں میں نیک کردار کو اچھائی اور برے کردار کو برائی ملتے دکھایا جاتا ہے مگر حقیقت میں اس کے برعکس ہوتا آیا ہے کہ زندگی کے حقائق میں یہ مشاہدہ اور تجربہ بھی ہوا ہے کہ نیک انسان زندگی میں دکھ جھیلتے ہیں، مصیبتیں اُٹھاتے ہیں اور رنج و آلام میں گرفتار رہتے ہیں جو صبر و شکر کے سہارے یہ سمجھ کر زندگی بسر کر دیتے ہیں کہ یہ اُن کے رب کی طرف سے آزمائش ہے اور اس کے برعکس گناہ گار، عصیاں کار، بدکار اور جفا کار و خطا کار لوگ زندگی بھر عیش کرتے ہیں۔ آسودہ حال رہتے ہیں اور بڑے آرام و سکون اور سکھ چین سے زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے بارے میں نیک لوگوں کی رائے ہوتی ہے کہ ان کو قدرت ڈھیل دے رہی ہے اور ان کے لیے دنیا ہی میں اجر دیا جا رہا ہے، آخرت میں ان کے

لیے کچھ حصہ نہیں ہوگا۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ جب یہ دونوں باتیں خیر وشر کے درمیان کش مکش پیدا کرتی ہے تو اخلاقی فلسفے کے تحت ان کا ایک رخ دکھانا زندگی کی حقیقت نہیں ہے۔ اس لیے ایسے ناول کم زور اور ناقص ہوتے ہیں۔ مگر جو ناول نگار انسانی زندگی کے دونوں پہلوؤں اور ہر ہر زاویے پر روشنی ڈالتے ہوئے ناول کی بُنت کرتے ہیں ان کے ناول، ناول کہلائے جانے کا حق رکھتے ہیں۔

انسانی کرداروں کے تضادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے اور وہ قسمت، تقدیر اور مقدر کے آگے بے بس و مجبور ہے۔ اس کی بے اختیاری اور لاچاری اسے وہ نہیں کرنے دیتی جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ فرض کیجیے ایک شخص تن درست و توانا رہنا چاہتا ہے تاکہ وہ آرام وسکون سے زندگی گزار سکے اور دوسرے کے کام بھی آسکے مگر اس کی ہزار ہا کوششوں کے باوجود بھی وہ ایسا کرنے سے قاصر رہتا ہے کیوں کہ کاتبِ تقدیر نے اس کے نصیب میں امراض اور بیماریاں لکھ دی ہوتی ہیں، اس لیے وہ امراض کا شکار ہو کر نہ تو تن درست و توانا رہتا ہے اور نہ دوسروں کے کام آسکتا ہے۔ وہ ساری زندگی اسے قدرت کی جانب سے آزمائش یا قسمت کا لکھا کہہ کر برداشت کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا ایسے کرداروں پر منفی اور برعکس اثرات اثر انداز ہونا فطری عمل ہے۔ یہ انسان کی بنیادی کم زوریاں اس کے کرداروں کی تباہی و بربادی کا باعث بنتی ہیں، لہٰذا ناول نگار کو ان پہلوؤں سے بھی کہانی کی بُنت کرنی چاہیے۔ ان حقائق کو بھی پیش کرنا چاہیے ان سے صرفِ نظر کرنا ناول میں جھول پیدا کرتا ہے۔

پاکستان میں جو ناول لکھے گئے ان میں ناول نگاروں نے سقوطِ ڈھاکا کے پس منظر میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ تحریکِ پاکستان اور تقسیمِ ہندوستان کے واقعات سے پیدا ہونے والے نظریات اور احساسات کو ناولوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ دنیا میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی پر ناول لکھے گئے ہیں۔ سیاسی بدعنوانیوں، کھلی دھاندلیوں اور سیاسی قلابازیوں پر ناول ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ آزادی کے بعد جو ناول لکھے گئے ان میں ناول نگاروں نے اپنے فلسفۂ حیات، نقطۂ نظر اور مقاصد کو کھل کر بیان کیا ہے۔ غرض کسی واقعے، سانحے، حادثے اور خارجی و داخلی تحرک سے پیدا ہونے والے جذبات کے تحت جو ناول لکھے گئے ان میں روحِ عصر کی

کارفرمائی مزید منظرِ عام پر آئی ہے۔ اسی طرح نئے اُردو ناول میں جو جدید طرزِ فکر کی جھلکیاں نظر آرہی ہیں وہ روحِ عصر ہی ہیں کیوں کہ مارشل لا، دہشت گردی، لسانیات، سیاسی بدعملی، جنگ وجدل، قتل وغارت اور طالبان وداعش کے جو معاملات سامنے آرہے ہیں وہ زمانے کی تاریخ ہی تو ہے۔ آج کا ناول نگار اپنے گرد وپیش سے بھی باخبر ہے اور دنیا کے بدلتے ہوئے معاشرتی پس منظر سے بھی واقف ہے۔ سائنسی علوم بھی اس کی دست رس میں ہیں اور ان سے ہونے والے تغیرات سے بھی وہ آشنا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کا اُردو ناول نیا، جدید اور پہلے سے بہتر بھی ہے کیوں کہ اس میں نئے نئے نظریات کو بھی ڈسکس کیا گیا ہے اور سائنس وفلسفہ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور صنعت وحرفت اور تجارت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آج کا ناول نگار نئے اُردو ناول میں جو پس منظر دکھا رہا ہے وہ بھی جدید مناظر سے آراستہ ہے اور جو پلاٹ پیش کر رہا ہے وہ تمام واقعات بھی عہدِ رواں سے لیے جا رہے ہیں اور جو نقطۂ نگاہ ناول میں سمویا جا رہا ہے اس کا تعلق بھی ہمارے معاشرے، ہماری سماجی رسوم ورواج اور گرد وپیش کے ماحول سے ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ناول کے مرکزی کرداروں، ان کے حالات وواقعات، ان کے اعمال وافعال اور ان کی گفتگو سے قارئین کے اذہان وقلوب لازمی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ ان پر ان کرداروں کا اثر انداز ہونا فطری عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ناولوں کا ایک حصہ پڑھتے ہوئے قارئین آب دیدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا واضح ثبوت ہے کہ ان کے دل ودماغ پر ناول کی کہانی، کردار اور واقعات نے اثر ڈالا ہے تبھی تو قلب وذہن نے اثر لیا اور متاثر ہو کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپک گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم فطری طور پر کچھ کرداروں سے مانوس ہوتے ہیں، ان کی صورت میں ہم اپنا آپ بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہم حساس دل ہونے کے سبب بہت جلد کرداروں کا اثر لے لیتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ ایک انسان ہے اس کے ساتھ ایسا ہوا، اگر میرے ساتھ ایسا ہوتا تو مجھے اتنا ہی دکھ درد محسوس ہوتا جتنا کہ اس کردار کو محسوس ہو رہا ہے۔ یہ خود آگاہی کی ایک منزل ہوتی ہے جہاں پہنچ کر ہمیں انسان یعنی اپنے آپ کی پہچان ہوتی ہے تب ہم انسان کا رتبہ اور اس کی تخلیق کا مقصد جان جاتے ہیں۔ ہم میں خیر وشر میں تمیز پیدا ہو جاتی ہے اور نیک کو نیک اور بد کو بد سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ہم ایسے انسان کے کردار کو پسند اور برے انسان کے کردار کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کا ذہن آغاز ہی سے کسی ناول

میں اچھے کردار کی حمایت میں ہو جاتا ہے اور برے کردار کو پہلے عمل ہی سے ناپسند کرنے لگتا ہے۔ کوئی ایک کردار ہمارے اندر کے آدمی سے مشابہ بھی ہوتا ہے، چاہے وہ خیالی کردار ہی کیوں نہ ہو۔ ہم اس کردار کے روپ میں اپنے آپ کو تصور کرتے ہیں اور جو اس کے ساتھ اچھا یا برا ہو رہا ہوتا ہے وہ ہم خود محسوس کرتے چلے جاتے ہیں جس کا اثر ہم پر تادیر قائم رہتا ہے۔

اُسلوبِ بیان (Style of Writing)

جہاں ناول میں پلاٹ، کردار، پس منظر اور نقطۂ نگاہ ضروری ہیں وہاں اُسلوبِ بیان بھی ایک ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری نظر میں اُسلوبِ بیان جس قدر دل کش اور دل موہ لینے والا ہوگا، قاری کے دل پر اس کا اثر اتنا ہی جلد اور دیر پا ہوگا۔ ہم اپنی حقیقی زندگی میں ان تجربات سے گزرتے رہے ہیں کہ جو بات انسان غصے اور نفرت سے نہیں مانتا، وہ نرمی اور محبت سے مان لیتا ہے۔ اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی بھی تحریر کو بیان کرنے کا انداز جتنا زیادہ موثر ہوگا اس کا اثر اتنا ہی گہرا اور تادیر قائم رہے گا۔ جس طرح کہتے ہیں کہ شعر وہی ہوتا ہے جو سنتے ہی دل میں اُتر جاتا ہے۔ ناول میں بھی اُسلوبِ بیان کی اہمیت اسی قسم کی ہے کہ آپ وہ اُسلوبِ اظہار اپنائیں جو عام فہم ہو، سادہ ہو، اور اس معاشرے سے تعلق رکھتا ہو جس میں اس کا قاری رہ رہا ہو، جس میں ناول نگار نے زندگی بسر کی ہو۔

دوسری صورت میں اگر آپ ایک ایسے معاشرے اور ماحول کی ناول میں ترجمانی کر رہے ہیں جس میں نہ تو آپ نے قدم رکھا ہے، نہ زندگی کے کچھ دن گزارے ہیں اور نہ اس کے ماحول اور تہذیب و ثقافت سے آشنا ہیں۔ ایسے معاشرے اور ماحول کے بارے میں آپ لکھتے ہیں تو اس میں غلطیوں کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ ایسی معلومات آپ نے سن کر حاصل کی ہوتی ہیں یا پھر کسی کتاب میں پڑھی ہوتی ہیں۔ سنی سنائی بات پر یقین کرنے کی ممانعت آئی ہے اور کتاب سے لی گئی معلومات میں یہ خدشہ ہوتا ہے کہ نہ جانے یہ معلومات مستند بھی ہیں یا نہیں۔ لہٰذا ایک اچھا ناول نگار اپنے ناول کی بنیاد حقیقی زندگی پر رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی سچی تصویروں سے اپنے ناول کو سجاتا ہے۔ گرد و پیش سے تعلق رکھنے والا ماحول بناتا ہے۔ اپنے معاشرے میں رہنے والوں کے کردار نبھاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ناول مانوس فضا میں پھلتا پھولتا ہے اور کہانی آگے بڑھتی ہے۔

ناول نگار اپنے تلخ و شیریں تجربات، شدید جذبات، احساسات اور عمیق مشاہدات کا اظہار مختلف اسالیب میں کرتا ہے۔ جس ناول نگار کا اُسلوبِ اظہار جس قدر شائستہ، شگفتہ، عام فہم اور تہذیب یافتہ ہوگا اس کا ناول اتنا ہی قابلِ مطالعہ رہے گا۔ قارئین کے نزدیک ناول کی کہانی کا جان دار ہونا ضروری ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک اچھی کہانی کو عامیانہ اُسلوبِ بیان تباہ کر دیتا ہے۔ اچھی کہانی کے لیے اچھا اُسلوبِ بیان لازمی و ضروری ہے۔ قاری کی نظر میں کہانی کی اہمیت ناول میں سب سے زیادہ ہے مگر اُسلوبِ بیان کی ضرورت اچھی کہانی کو عمدہ انداز و پیرائے میں پیش کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے کیوں کہ داخلی حرکات کو عمدہ بیان کے ذریعے ہی موثر انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ناول کی قدر و قیمت بڑھانے میں کہانی کے بعد اُسلوبِ بیان کا نمبر آتا ہے۔ اُردو ناول کی ابتدا میں سیدھے سادے انداز میں کہانی بیان کر دی جاتی تھی مگر آج کا ناول نگار بالکل سادہ چلنے کو سپاٹ انداز کا نام دیتا ہے اور اپنی تحریر کو اُسلوبِ بیان سے سجا کر اور نئے اندازِ تخاطب سے نکھار کر سامنے لاتا ہے۔ وہ واقعات کو ترتیب سے پیش کرتا ہے، واقعات کے مطابق پس منظر دکھاتا ہے۔ کرداروں کے مطابق ماحول پیش کرتا ہے۔ اس تمام کے ساتھ کرداروں کا باہمی تعلق اور ان کی گفتگو کا انداز دل نشیں ہونا ناول کی کام یابی کی ضمانت ہے۔

ناول نگار اپنی تخلیق کو الفاظ کے سہارے کس محنت سے پیش کرتا ہے اس کا اندازہ قاری کو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کا اندازہ ایک جید نقاد ہی کر سکتا ہے کہ تخلیق کار نے کس قدر محنتِ شاقہ، عرق ریزی، باریک بینی، یک سوئی اور دماغ سوزی سے اپنے افکار و خیالات کو کہانی بنایا اور کہانی کو کس طرح ناول کے روپ میں پیش کیا۔ اپنے جذبات، مشاہدات، تجربات اور احساسات کو الفاظ کے سہارے صفحۂ قرطاس پر پینٹ کرنا آسان سہی مگر عمدہ پینٹنگ کا نمونہ بنانا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن حد تک دشوار ہے۔ یہ جو ہمارے سامنے ایک ناول کی صورت میں کوئی تحریر مجسم ہو کر آ جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ پوری کتاب ناول نگار نے ایک ہفتے یا ایک ماہ میں آسانی سے لکھ دی ہوگی! ہرگز نہیں۔ بلکہ اس منزل تک ناول کو پہنچانے میں ناول نگار متعدد سخت مراحل، کٹھن راستوں اور دشوار گزار راہوں سے گزرا ہوگا۔ جس طرح ایک شاعر اچھا مصرع کہہ کر دوسرا مصرع اس معیار کا کہنے کے لیے رات بھر کمرے میں بے چینی سے ٹہلتا رہتا ہے اور جب تک اس کے ذہن کے مطابق بات نہ بن جائے اسے سکون و چین میسر نہیں آتا۔ یہ تخلیق کا درد اور کرب و اذیت

کہلاتی ہے۔ کوئی عبقری تخلیق کار ان مراحل سے بچ کر گزر نہیں سکتا۔ لہٰذا جس طرح ایک ماں کو اپنے بچے سے اس لیے بھی حد درجہ پیار ہوتا ہے کہ اس ماں نے بچے کی پیدائش کے مراحل سے گزرتے ہوئے جن تکالیف اور دکھ درد کو سہا ہے اس کے نتیجے میں وہ اولاد اسے ملی ہے۔ اسی طرح ایک تخلیق کار اپنی تخلیق ایسے ہی تمام مراحل سے گزر کر پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے، لہٰذا اسے اپنی تخلیق سے حد درجہ پیار ہوتا ہے کیوں کہ یہ تخلیق اسے دکھ درد سہہ کر صبر آزما مراحل سے گزر کر اور مصائب واذیتیں برداشت کر کے میسر آئی ہے۔ لہٰذا وہ اسے مؤثر، مودّب اور مہذّب اُسلوبِ بیان میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جو قارئین کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ اس تحریر کا اس کے دل و دماغ اور ذہن پر دیرپا اثر ثابت ہوتا ہے۔

اس معاملے کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک ماں اپنے بچے کی اچھی تربیت کرتی ہے۔ اچھی تعلیم دیتی ہے اور اپنی نگہ داشت میں بہترین پرورش کے مراحل سے گزارتی ہے۔ اس کی بول چال، لب ولہجہ اور اندازِ تکلم کو سنوار کر اور مہذّب و مودّب بنا کر نکھارتی ہے تا کہ اس کا بچہ جب کسی سے بات چیت کرے تو لوگ اس کی گفت و شنید پر توجہ دیں، اس کے لب ولہجہ سے مرعوب ہوں اور علمیت اور ذہنی صلاحیت کی تعریف کریں اور علمی استعداد پر شاباشی پیش کریں۔ جب ایسا ہوتا ہے کہ ماں کا دل یہ دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے کہ اس نے بچے کی پرورش، تربیت اور تعلیم کا خیال جس طرح رکھا آج اس کی بدولت دنیا اس کے بچے سے پیار کر رہی ہے۔ تعریفی جملوں سے نواز رہی ہے اور اس کی ہر ادا اور لب ولہجہ کی تحسین ہو رہی ہے کہ بچے سے زیادہ ماں کا دل خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جب کسی تخلیق کار کی تخلیق زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آتی ہے اور جب اس کی تعریف میں لوگ رطب اللسان ہوتے ہیں تو تخلیق کار کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے، وہ خوش ہوتا ہے کہ کوئی قاری اس کی تخلیق ناول کے پلاٹ کی تعریف کر رہا ہے تو کوئی اس کے کردار کی تحسین۔ کوئی اُسلوبِ بیان کی تقریظ لکھ رہا ہے تو کوئی نقطۂ نظر کی توصیف، اس سے تخلیق کار کی محنت کا ثمرہ سامنے آتا ہے اور اس کا حوصلہ بڑھتا ہے جس کے سبب وہ مزید بہتر سے بہتر شاہ کار تخلیق پیش کرنے کی کوشش میں مگن و مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ بہتر سے بہتر الفاظ و محاورات کا نہ صرف انتخاب کرتا ہے بلکہ اس کے عمدہ استعمال سے اُسلوبِ بیان کو مزید دل کش اور جاذبِ نظر

بناتا ہے۔ وہ اس میں زندگی کی سچی تصویر پیش کر کے تصویرِ زندگی میں حقیقت کا رنگ بھر کر امر کر دیتا ہے اور زندگی کے دھندلے نقشے کو مٹنے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور معاشرے کی مسخ شدہ صورت کو نقوش عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان تمام معاملات میں جمالیات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ جمالیات اگر ناول نگار کے ذہن میں راسخ ہیں اور اگر قدرت نے اسے یہ ملکہ ودیعت کیا ہے تو سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے۔

انسان ہر منظر اور واقعے میں جمالیات دیکھنے کا قائل ہے۔ اسے سلیقہ مندی پسند ہے لہٰذا ناول نگار کے ذہن میں اس کا قاری اور اس قاری کا معیار راسخ ہوتا ہے، اس لیے وہ ہر کام سلیقہ مندی، کمال ہوشیاری اور ہنرمندی سے انجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ناول کے واقعات کو ترتیب سے پیش کرتا ہے، کردار چنتا ہے، پس منظر واقعات اور کرداروں کے مطابق لاتا ہے اور سب سے بڑھ کر اُسلوبِ بیان کی عمدگی اور درستگی کی طرف توجہ دیتا ہے کیوں کہ اُسلوبِ بیان ہی کے ذریعے اسے اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کرنا ہوتی ہے۔ اپنے افکار کا ابلاغ کرنا ہوتا ہے اور اپنے مقاصد پانے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب ناول نگار کا اُسلوب زندہ ہو کیوں کہ مردہ اُسلوب ناول کی عبارت کو بھی بے جان کر دیتا ہے جس سے ناول نگار کی بھی موت واقع ہو جاتی ہے اور زندہ اُسلوب ناول کو نئی زندگی عطا کرتا ہے بلکہ اسے شہرتِ دوام کی منزل سے گزار کر فن کی معراج عطا کرتا ہے۔

◆◆◆

ناول کے لوازمات

(مغربی و مشرقی مفکرین کی نظر میں)

آج تک مشرقی و مغربی مفکرین نے ناول کے بارے میں جس قدر بیانات دیے ہیں وہ پیشِ خدمت ہیں یہ بیانات مختلف کتابوں میں موجود ہیں جو مختلف زمانوں میں شایع ہوئیں۔اس لیے ارتقائی لحاظ سے ناول کے نظریات ناسخ و منسوخ ہوتے رہے ہیں۔صرف معلومات کے لیے یہ نظریات پیش کیے جا رہے ہیں ان سے نتائج اخذ نہ کیے جائیں:

۱۔ ناول میں حقیقت نگاری اہم عنصر قرار پاتا ہے۔
۲۔ رموزِ حیات کو ناول میں آشکار کیا جاتا ہے۔
۳۔ ناول میں اسرارِ کائنات سے پردہ ہٹایا جاتا ہے۔
۴۔ فطری مظاہر کے مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔
۵۔ ماحول کی جلوہ گری ناول میں ہوتی ہے۔
۶۔ معاشرے کی عکاسی ناول کی زینت ہے۔
۷۔ عصرِ حاضر کا تبصرہ ناول کا جزو ہے۔
۸۔ ناول زمانے کی تاریخ مرتب کرتا ہے۔
۹۔ ناول زندگی کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔
۱۰۔ ناول میں حق بیانی سے کام لینا چاہیے۔
۱۱۔ ناول میں معاشرے کی ماہیت کا اندازہ ہوتا ہے۔
۱۲۔ زندگی کی حقیقت ناول میں بہتر طور پر بیان ہو سکتی ہے۔

۱۳۔ ناول ذاتی تاثرات کا مجموعہ ہے۔
۱۴۔ ناول افکار و خیالات کی البم ہے۔
۱۵۔ ناول تلخ و شیریں تجربات پر مبنی ہوتا ہے۔
۱۶۔ عمیق مشاہدات ناول کا حصہ ہوتے ہیں۔
۱۷۔ ناول نگار کی باریک بینی کارگر ثابت ہوتی ہے۔
۱۸۔ ناول آدابِ زندگی کا بیانیہ ہے۔
۱۹۔ بدلتے ہوئے رجحانات کا اندازہ ناول سے ہو جاتا ہے۔
۲۰۔ ناول میں تبدیل ہوتے میلانات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔
۲۱۔ معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ناول میں پیش کیے جاتے ہیں۔
۲۲۔ ناول نگار اپنا نقطۂ نگاہ ناول میں بہ آسانی سمو دیتا ہے۔
۲۳۔ ناول سے زندگی میں بدلاؤ لایا جا سکتا ہے۔
۲۴۔ تغیراتِ زمانہ کی نشان دہی ناول سے ہو سکتی ہے۔
۲۵۔ ناول نگاری سے بیمار معاشرے کا علاج ممکن ہے۔
۲۶۔ معاشرتی ناسوروں کے لیے ناول آلۂ جراحت کا کام کرتا ہے۔
۲۷۔ کسی بھی ناول نگار کے فنی نظریات کو ناول کی تحریر میں پرکھا جا سکتا ہے۔
۲۸۔ ایک اچھا ناول نگار اپنے ناول میں نظر نہیں آتا۔
۲۹۔ انسان کے داخلی و خارجی جذبات کا اظہار ناول میں ممکن ہے۔
۳۰۔ افکار اوران کا ارتقا ناول ہی کے ذریعے ممکن ہے۔
۳۱۔ ناول میں فنونِ لطیفہ سے بھی مدد لینا چاہیے۔
۳۲۔ شعر و ادب کے سہارے بھی ناول کو زینت بخشی جا سکتی ہے۔
۳۳۔ ناول کا عمدہ اُسلوبِ بیان اسے زندہ رکھتا ہے۔
۳۴۔ حقیقت آفرینی ناول کا حسن ہے۔
۳۵۔ ناول اخلاقی اقدار کا مجموعہ ہے۔
۳۶۔ ناول میں روزمرہ زندگی کے واقعات کو ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے۔

۳۷۔ انسان اور اس کی زندگی ناول کے مرکز و محور ہیں۔

۳۸۔ عمدہ کرداروں کا تعین ناول نگار کی باریک بینی ہے۔

۳۹۔ ناول کی عمدہ عمارت عمدہ پلاٹ پر تعمیر کی جا سکتی ہے۔

۴۰۔ واقعات کی مناسبت سے پس منظر کا چناؤ ناول کی خوب صورت میں اضافہ کرتا ہے۔

۴۱۔ عمدہ اُسلوبِ بیان کسی بھی ناول کی جان ہوتا ہے۔

۴۲۔ ناول میں فلسفۂ حیات پر کھل کر گفتگو ہوتی ہے۔

۴۳۔ ناول میں جمالیاتی عناصر حسن پیدا کرتے ہیں۔

۴۴۔ ناول کسی بھی ناول نگار کے فکر و فن کا آئینہ ہوتا ہے۔

۴۵۔ ناول میں بین السطور صوفیانہ نظریات سموئے جا سکتے ہیں۔

۴۶۔ فطری حقائق کو منکشف کرنا ناول کی ادا ہے۔

۴۷۔ انسان کی ذہنیت کا ادراک ناول سے ہو سکتا ہے۔

۴۸۔ لامحدود عصری موضوعات ناول کی ابتدا ہیں۔

۴۹۔ ناول واقعیت پسندی کی آماج گاہ ہے۔

۵۰۔ ناول نگار اپنی دست کاری سے سماج کی خدمت کرتا ہے۔

۵۱۔ ناول اعلیٰ جذبات کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔

۵۲ ناول میں نشاطیت کا پہلو بھی اہم ہیں۔

۵۳۔ جنسی خواہشات کا اظہار ناول کے ذریعے کیا جانے لگا ہے۔

۵۴۔ زندگی سے بےزاری کا ردِعمل ناول میں بیان کیا جاتا ہے۔

۵۵۔ ناول نگار اپنے ذاتی احساسات کو دوسروں تک ناول کے ذریعے پہنچاتا ہے۔

۵۶۔ مغرب میں ناول ذہنی عیاشی اور لذتیت کے لیے بھی لکھے گئے ہیں۔

۵۷۔ مشرق میں اصلاح پسند افکار کا پرچار ناول کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

۵۸۔ ناول میں عوامی اساطیر کو بہ آسانی بیان کیا جا سکتا ہے۔

۵۹۔ انسان دوستی ناول کی بنیاد ہے۔

۶۰۔ اخلاقی نظریات افسانوی انداز میں ناول میں بیان کیے جا سکتے ہیں ورنہ ناول اخلاقیات کی درسی کتاب کہلانے کا مستحق ہوگا۔

۶۱۔ ناول کی عبارت میں جذبات کی تاثیر سموئی جا سکتی ہے۔

۶۲۔ نئے ناول میں نئی تکنیکوں کا استعمال خوش آئند ہے۔

۶۳۔ نئے تجربات کا ناول میں درآنا ناول کو نئی زندگی دیتا ہے۔

۶۴۔ ناول میں نظریہ سازی کو بہت ہوا دی گئی ہے۔

۶۵۔ نفسیاتی مسائل کو ناول میں برتنا ناول کی اضافی خوبی ہے۔

۶۶۔ ناول میں معاشرے و ماحول کا سائنسی جائزہ لینا چاہیے۔

۶۷۔ ناول کا خاکہ فن کار کے ذہن میں ہوتا ہے۔

۶۸۔ ناول محض تخیلی تجربہ نہیں ہوتا۔

۶۹۔ ناول انسانی دستاویز ہوتا ہے۔

۷۰۔ ناول دورِ حاضر کی سب سے اہم صنفِ ادب ہے۔

۷۱۔ ایک اچھے ناول نگار کے لیے شاعر اور فلسفی ہونا بھی ضروری ہے۔

۷۲۔ مشاہدۂ فطرت میں تخیل کے رنگ بھرنا ناول نگار کا فرض ہے۔

۷۳۔ پوشیدہ حقیقتوں کو بے نقاب کرنا ناول نگار اپنا فن سمجھتا ہے۔

۷۴۔ خارجی حقیقت نگاری سے ناول میں کمال پیدا کیا جا سکتا ہے۔

۷۵۔ اگر ناول نگار کے اندر فطری صلاحیت موجود ہے تو وہ بدصورتی میں بھی خوب صورتی کا حسن پیدا کر سکتا ہے۔

۷۶۔ اپنے دور کے حالات بیان کرنا ناول کی شان ہے۔

۷۷۔ ناول نثر کی وہ صنف ہے، جس میں مصنف اپنے جذباتی وجود کے ذریعے انسانی صورتِ حال کی مختلف جہتیں دریافت کرتا ہے۔

۷۸۔ زندگی کے موضوعات کو ایک ناولیاتی فضا ہی میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۷۹۔ ناول کسی تخفیف شدہ حقیقت کا اظہار نہیں۔

۸۰۔ ناول کسی صورتِ حال کے ان بے شمار پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جو اپنے کرداروں کی تال میل سے انسانی وجودی کیفیت کو آشکار کرتے ہیں۔

۸۱۔ ناول میں موجود مزاح، ستم ظریفی، کھیل، وقت اور تاریخی واقعات کے پہلو اس کی معنی آفرینی میں اضافہ کرتے ہیں۔

۸۲۔ ناول کے کردار ناول نگار کے ذاتی تصورات سے آزاد ہو کر اپنی دنیا آپ تشکیل کرتے ہیں۔

۸۳۔ جو ناول نگار اپنے کرداروں کی نسبت زیادہ ذہین ہے وہ اچھا ناول نگار نہیں۔

۸۴۔ ناول کسی سیاسی ایجنڈے کا علم بردار نہیں۔

۸۵۔ ناول kitsch (جیسے کوئی جھوٹ کو خوب صورتی میں بدلنے والے آئینے میں خود کو دیکھے اور اپنے ہی عکس کی شکر گزاری میں آب دیدہ ہو جائے) کو رد کرتا ہے۔

۸۶۔ ناول میں سماج میں دبے ہوئے انسانی وجود کے پنہاں گوشوں کو آشکار کیا جا سکتا ہے۔

۸۷۔ اچھا ناول وہ تخیلی تصنیف ہے جو ماضی کے رزمیہ اور ڈرامائی شاہ کاروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

۸۸۔ ناول میں پاکیزہ جذبات کو اسفل جذبات پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔

۸۹۔ ذہنی کیفیات کو حیوانی جبلتوں پر حاوی کیا جا سکتا ہے۔

۹۰۔ ناول کا مواد انسانی فطرت اور خارجی ماحول سے اخذ کیا جاتا ہے۔

۹۱۔ ناول کو ہم قاموسِ حیات بھی کہہ سکتے ہیں۔

۹۲۔ ناول میں ساری کائنات کو سمیٹ لینے کی صلاحیت موجود ہے۔

۹۳۔ ناول عصری ادب کا اہم کارنامہ ہے۔

۹۴۔ ناول میں سماج کے رستے زخموں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

۹۵۔ ناول میں شفافیت کے اصول کو برقرار رکھنا ناول کا حق ہے۔

۹۶۔ اچھے ناول کی موثر تحریر سے اذہان کو بدلا جا سکتا ہے۔

۹۷۔ کسی معاشرے کو بگاڑنے یا سنوارنے میں ناول اہم کردار ادا کرتا ہے۔

۹۸۔ ناول تصورِ حیات کے اظہار کا موثر ذریعہ ہے۔

۹۹۔ ناول نئے مقاصد پانے کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔

۱۰۰۔ ناول میں کہانی کو عضویاتی ہونا چاہیے۔

۱۰۱۔ ناول میں کہانی سے پہلے کوئی خاص بات نہیں ہونی چاہیے۔

۱۰۲۔ ناول کے اختتام کے بعد بھی کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے۔

۱۰۳۔ ناول کی کہانی میں جو کچھ بیان کیا جائے اس کا ایک دوسرے سے لازمی رشتہ ہونا چاہیے۔

۱۰۴۔ ناول کے پلاٹ میں ترکیب کی وحدت اور ''واحد کہانی'' ضروری ہے۔

۱۰۵۔ الیہ فضا میں بھی ناول لکھے جاتے رہے ہیں۔

۱۰۶۔ ناول معاشرے کی عکاسی بہتر انداز میں کرتا ہے۔

۱۰۷۔ زندگی کے نشیب و فراز، خوشی و غم، کام یابی و ناکامی سے ناول کا تانا بانا بہتر طور پر بُنا جا سکتا ہے۔

۱۰۸۔ ناول کی کام یابی کا راز کہانی کی دل چسپی میں مضمر ہے۔

۱۰۹۔ ناول نگار کو اپنی کہانی سے قاری کو حیرت زدہ کر دینا چاہیے۔

۱۱۰۔ ناول کی ترکیب میں خارجی عناصر کے ساتھ آفاقی عناصر کے امتزاج سے بھی اعلیٰ فن پارے کی تخلیق ممکن ہے۔

۱۱۱۔ ناول سے ذہنی انبساط حاصل ہوتا ہے۔
ناول سے انسانی اقدار کی توسیع بھی ہو سکتی ہے۔

۱۱۲۔ کہانی میں خارجی حسنِ ترکیب کے ساتھ دوسرے اجزا کی ہم آہنگی لازم ہے۔

۱۱۳۔ ناول کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے۔

۱۱۴۔ ناول نگار انفرادی زاویے سے زندگی پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسی کے نتیجے میں اُسلوبِ بیان وجود میں آتا ہے۔

۱۱۵۔ ناول کے اُسلوبِ بیان میں تصنع، تکلف اور رسمی لوازمات بھی ہونے چاہیے۔

۱۱۶۔ حقائق اور مظاہر کی روح تک پہنچنے کے لیے ناول میں ایسی زبان کو استعمال کرنا چاہیے جس سے ان کی تمام خصوصیات ہم پر روشن ہو جائیں۔

۱۱۷۔ فطری اُسلوب کے لیے زبان و بیان کی نفاست سے زیادہ انفرادیت اور جاذبیت ضروری ہے۔

۱۱۸۔ زندہ اُسلوب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زیادہ بناؤ سنگھار نہ ہو۔

۱۱۹۔ ناول میں کہیں کہیں بے پروائی اور معمولی سی سادگی بھی عبارت میں جان ڈال دیتی ہے۔

۱۲۰۔ ناول میں روحِ عصر کی جھلک نمایاں طور پر نظر آنی چاہیے۔

۱۲۱۔ ناول میں قاری حقیقت پسندی کی کارفرمائی اور مصنف کی انفرادی جھلک دیکھنا پسند کرتا ہے۔

۱۲۲۔ فن کی ترقی مباحثہ، تجربہ اور تجسس پر مبنی ہوتی ہے۔

۱۲۳۔ حقیقت نگاری، رومانیت اور ہیئت پرستی کے محدود دائروں سے ناول بالاتر ہوتا ہے۔

۱۲۴۔ مغربی ناول نگار کلی طور پر فن برائے فن کا مقلد ہوتا ہے۔

۱۲۵۔ مشرقی ناول نگار فن برائے زندگی کا علم بردار ہوتا ہے۔

۱۲۶۔ ناول میں اس قدر لچک اور وسعت ہوتی ہے کہ یہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا بخوبی احاطہ کر سکتا ہے۔

۱۲۷۔ ناول نگار اپنی قوتِ ممیزہ سے کام لے کر چند نمایاں رنگوں کا انتخاب کر کے اپنے تخیل سے مختلف اجزائے فن پاروں کی تخلیق کرتا ہے۔

۱۲۸۔ زندگی کے باغ سے ناول نگار ایسے پھول چنتا ہے جس سے وہ خوب صورت ہار بنا سکتا ہے۔

۱۲۹۔ ناول کے فن کا پھول اس وقت کھلتا ہے جب اس کا تعلق ناول نگار کی روح کی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔

۱۳۰۔ بڑا ناول نگار، بڑے درجے کا شاعر ہوتا ہے۔

۱۳۱۔ وسعت، جامعیت اور معنویت کے امکانات کے پیشِ نظر ناول ایک ممتاز فن کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۳۲۔ ناول محض خواب کی دنیا آباد کرتا ہے۔

۱۳۳۔ ناول کا براہِ راست تعلق شاعری، فلسفہ، موسیقی اور مصوری سے ہے۔

۱۳۴۔ ناول کے فن میں شعریت بھی داخل ہے۔

۱۳۵۔ ناول میں وحدتِ تاثر، اختصار اور ارتکاز پایا جاتا ہے۔

۱۳۶۔ اچھے ناول کی لازمی خصوصیات میں ڈرامائیت کا عنصر لازم ہے۔

۱۳۷۔ ناول، ڈرامے سے بالکل مختلف چیز ہے۔

۱۳۸۔ ناول اور ڈرامے کے فنی لوازمات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۱۳۹۔ ناول، ناول نگار کے ذاتی تاثرات کا فن کارانہ اظہار ہوتا ہے۔

۱۴۰۔ ناول کے محل میں ایک نہیں لاکھوں کھڑکیاں ہوتی ہیں۔

۱۴۱۔ ہر منظر کو ہر ناول نگار اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے۔

۱۴۲۔ کائنات کی وسعتوں میں انسانی زندگی کے مناظر کا مطالعہ اور ان کے انتخاب کا عمل ہی ناول نگار کا بنیادی فریضہ ہے۔

۱۴۳۔ ناول کے وسیع دامن میں رجائی، قنوطی، تخیلی، جمالیاتی، افادی، اشتراکی اور دیگر نظریات کی گنجائش ہے۔

۱۴۴۔ ناول نگار انسانی زندگی سے اپنے فن کا مواد حاصل کرتا ہے۔

۱۴۵۔ ناول کا فن تخیلی تجربے اور احساسِ شعور کی پیداوار ہے۔

۱۴۶۔ ناول نگار کو اپنے تجربات اور مشاہدات کی دنیا سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔

۱۴۷۔ ناول کے مواد اور ان کے پس منظر میں فنی یکانگت لازمی ہے۔

۱۴۸۔ اچھا ناول نگار انسانی تجربوں سے وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۴۹۔ مغربی ناول نگار جذبات کی حد تک آزاد ہو جاتے ہیں۔

۱۵۰۔ مشرقی ناول نگار اخلاقی ضابطوں اور سماجی تقاضوں کے اظہار میں زیادہ محتاط نظر آتے ہیں۔

۱۵۱۔ زندگی سے ماخوذ مواد کو ناول کے قالب میں ڈھالنے کا تخلیقی عمل بہتر ہے۔

۱۵۲۔ ناول نگار اپنے ناول کو تکمیل تک پہنچانے سے پہلے تمام افراد، اشیا، کیفیات اور حالات کے درمیان رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۵۳۔ ناول نگار مطلوبہ مواد کا انتخاب کر کے اسے خاص ترتیب کے مطابق فنی شکل دیتا ہے۔

۱۵۴۔ ہر ناول کی تخلیق کے پیچھے اس کی تاریخ اور کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے۔

۱۵۵۔ ہر ناول نگار پہلے اپنے موضوع کو محسوس کرتا ہے اور پھر اسے برتنے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۵۶۔ کسی بھی ناول کے موضوع کا احساس دراصل غور و فکر کی صلاحیت ہے۔

۱۵۷۔ جس ناول نگار کی قوتِ متخیلہ جتنی اعلیٰ درجے کی ہوگی وہ اتنا ہی اعلیٰ پائے کا فن کار ہوگا۔

۱۵۸۔ کہانی میں محیر العقول اور مافوق الفطرت عناصر کی افراط سے ناول فنتاسی میں بدل جاتا ہے۔

۱۵۹۔ ضرورت سے زیادہ خارجی تفصیلات سے ناول محض واقعات کی کتاب بن کر رہ جاتا ہے۔

۱۶۰۔ اعلیٰ درجے کے ناولوں میں رومان اور حقیقت دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔

۱۶۱۔ ناول کے واقعات کے درمیان خاص تناسب ہونا چاہیے۔

۱۶۲۔ ناول نگار کا یہ فن ہے کہ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرے جیسے ہمارے سامنے وقوع پذیر ہو رہے ہوں۔

۱۶۳۔ ناول کے تمام کردار ایسے نظر آنے چاہیے جیسے وہ خارجی اثرات کو اپنے اندر جذب کر کے اپنا ردِ عمل ظاہر کر رہے ہوں۔

۱۶۴۔ ناول میں زندگی کی ترجمانی کرداروں کے افکار و اعمال پر ہی منحصر ہے۔

۱۶۵۔ جدید ناول میں کہانی بیان کرنے والا ہمہ دانی کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

۱۶۶۔ ناول نگار جب تک کرداروں کے باطن میں نہیں جھانک لیتا، اس وقت تک ان کے اعمال اور محرکات کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا۔

۱۶۷۔ ایسے ناول ناکام ہو جاتے ہیں جن میں زندگی اور شعوری بہاؤ تو ملتا ہے، مگر خود زندگی کا پتا نہیں چلتا۔

۱۶۸۔ سیدھی نظر کے مقابلے میں ترچھی نظر کو ناول نگاری کے فن میں ترجیح ملنی چاہیے کیوں کہ اس تکنیک سے حقیقت کے مخفی پہلوؤں کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۶۹۔ ناول نگار اپنی داخلی دنیا میں رہ کر خاموشی سے اپنے اردگرد زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور اپنے دکھ درد کا اظہار بھی بند لبوں یا محض سرگوشیوں سے کرتا ہے۔

۱۷۰۔ فن یک سوئی کے ساتھ کائنات اور عالمِ مظاہر کی اس ترجمانی کا نام ہے جس میں حقیقت کے ہر گوشے کو منور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۱۷۱۔ ناول نگار فن کی دنیا کا بادشاہ ہوتا ہے۔

۱۷۲۔ ناول نگار اپنی تخلیقات کے ذریعے عوام الناس کی نمائندگی اور راہ بری کرتا ہے۔

۱۷۳۔ ناول نگار زندگی کے سربستہ اسرار و رموز سے پردے اُٹھاتا ہے۔

۱۷۴۔ ناول نگار ہمارے جذبات کے پوشیدہ خانوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

۱۷۵۔ ناول نگاری کے لیے مصوری کی رنگ آمیزی، سنگ تراشی کا فن اور موسیقی کی سحر آفرینی لازم چاہیے۔

۱۷۶۔ کسی اہم واقعے کو مرکز بنانا کسی اچھے منصوبہ بند ناول کا بنیادی اصول ہے۔

۱۷۷۔ ناول کی تشکیل میں انسانی مہمات، حقیقت، رومان اور خواب و خیال کی اہمیت ہے۔

۱۷۸۔ ناول نگار کو اپنے فن میں خلوص، وفاداری، انسانیت اور فلسفیانہ اعتدال پسندی اختیار کرنی چاہیے۔

۱۷۹۔ ناول کا فن بڑی دل سوزی کا نام ہے اور اس کے لیے عمیق مطالعۂ فطرت، باریک مشاہدہ اور تخلیقی تخیل لازم ہے۔

۱۸۰۔ سطحی مشاہدات کو عمیق مشاہدات سے امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ناول نگار کے لیے ضروری امر ہے۔

۱۸۱۔ ناول اگر فکر سے علاقہ نہیں رکھتا تو وہ ناول کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے۔

۱۸۲۔ ناول عصری، ماضی اور مستقبل کی زندگی کی حیرت انگیز کتاب ہے۔

۱۸۳۔ ناول میں وہ باتیں بھی سموئی جاسکتی ہیں جو دیگر اصنافِ ادب میں کہنا مشکل ہیں۔

۱۸۴۔ ناول گلیلیوں کی دوربین سے بڑی ایجاد ہے۔

۱۸۵۔ ناول خفیہ کوڈز میں بیان کی گئی حقیقتوں کا نام ہے۔

۱۸۶۔ چھوٹے کینوس کے ناول بڑے سوالات اُٹھاتے ہیں۔

۱۸۷۔ ناول نے پوری دنیا میں اپنے فکر وفن کے لحاظ سے اپنا لوہا منوایا ہے۔

۱۸۸۔ ناول ایک تہلکہ خیز صنفِ ادب ہے۔

۱۸۹۔ ناول تفریح کا سامان نہیں ہے۔

۱۹۰۔ مجموعی طور پر ہمارا اُردو ناول اس پوزیشن میں آگیا ہے کہ کردار نگاری، اُسلوب، موضوع اور زبان و بیان کی توانائی کے حوالے سے اسے دنیا کی دیگر اصنافِ نثر کے سامنے رکھا جاسکتا ہے۔

نوٹ:

مغربی اور مشرقی مفکرین کی آرا ناول کے حوالے سے تحریر کردی گئی ہیں مگر ان آرا سے عام قاری بھٹک سکتا ہے کیوں کہ یہ مختلف الذہن ناقدین اور مختلف نظریے کے حامل مشاہیر کی آرا ہیں جن میں متعدد آرا نہ صرف تبدیل ہو چکی ہیں بلکہ رد بھی کی جاچکی ہیں۔ اس لیے قاری ان آرا سے معلومات تو حاصل کرسکتا ہے مگر ان کی روشنی میں ناول کی سمت متعین نہیں کرسکتا۔ لہٰذا نئے لکھنے والوں کے لیے موجودہ زمانے میں رائج ناول کے فن کے نقاط کو سامنے رکھنا چاہیے جو ہم نے پوری کتاب میں تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کردیے ہیں۔

***

اُردو ناول کے اہم پہلو

سجاد حیدر یلدرم سے فکشن کے تراجم اور ڈپٹی نذیر احمد سے شروع ہونے والی طبع زاد ناول نگاری نے آج جو روپ اختیار کرلیا ہے وہ نہایت دیدہ زیب اور خوب صورت ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو ناول کی تخلیقی عمر شعری ادب سے نہایت کم ہے مگر اس کم عرصے میں ناول جو کئی مراحل سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے وہ خوش آئند اور قابلِ ذکر ہے۔ کیوں کہ اکیس ویں صدی میں جو ناول لکھا جارہا ہے وہ ناول کے معیار پر پورا اُتر رہا ہے۔ وہ آج کے جدید عہد اور ترقی یافتہ دور سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے موضوعات بھی جدید ہیں اور یہ نئے سائنسی علوم وفنون اور جدید ٹیکنالوجی کو ساتھ لے کر چل رہا ہے۔ اپنے اُسلوبِ بیان میں طاق ہونے کی وجہ سے عالمی ادب کے مقابل آسکتا ہے اور ناول کے دیگر زبانوں میں تراجم نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ اُردو ناول دیگر زبانوں کے ادب کے ہم پلہ ہے اور ان سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اُردو نال نے اکیس ویں صدی میں جو ارتقائی سفر کی منازل طے کی ہیں اس میں سب سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُردو ناول کی تحقیق و تنقید کا عمل تواتر و تسلسل سے ہو رہا ہے۔ ہمارے فکشن کے ناقدین نے اُردو ناول کو مغربی ناول کے ہم پلہ بنانے کے لیے اس کے نقائص کی نشان دہی کی ہے اور ناول نگاری کو درپیش مسائل اجاگر کیے ہیں اور ساتھ ہی ان کا حل بھی بتایا ہے۔ اُردو ناول کے ناقدین نے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اُردو ناول کے محاسن پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اُردو ناول نگاروں نے محاسن کا دامن تھام لیا ہے اور اپنی تحریر کے نقائص کو دور کر کے ان کو خوبیوں میں بدلنے کی حتی الامکان کوششیں کی ہیں۔ یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ ہمارے ناول نگار ان کوششوں میں پوری طرح کام یاب و کامران نہیں ہوئے ہیں مگر بڑی حد تک اس راہ پر گامزن ضرور ہوگئے ہیں اور صراطِ مستقیم یعنی سیدھی اور ایک ہی راہ پر چل

رہے ہیں۔ابھی اُردو ناول نگاری کی تحقیق وتنقید میں بہت گنجائش ہے جس پر مزید کام ہونے کی ضرورت ہے۔لہٰذا ہمارے ناقدین کو چاہیے کہ عالمی سطح پر لکھے جانے والے دیگر زبانوں کے ناول اور ناول کے فن پر تحریروں کا مطالعہ کریں اور قارئین و ناول نگاروں کو بتائیں کہ اُردو ناول میں کیا کیا تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے اور کون کون سے موضوعات تشنہ طلب ہیں۔بہت سے موضوعات ایسے ہیں جن پر بہت کم لکھا گیا ہے اور بہت سے ایسے ہیں جن پر ابھی تک لکھا ہی نہیں گیا۔

ایسے موضوعات بہت زیادہ ہیں جن پر خوب لکھا جا چکا ہے اور آج بھی لکھا جارہا ہے، یہ پامال موضوعات ہیں جو یکسانیت کا شکار ہوگئے ہیں۔اب ان سے دامن چھڑانے کی ضرورت ہے۔لہٰذا ہمیں ناول میں عشق و محبت، لب و رخسار اور گل و بلبل کے قصے ختم کرکے دنیا کے بدلتے ہوئے حالات، نئے رجحانات اور تبدیل ہوتے میلانات کو موضوع بنانا چاہیے۔اکیس ویں صدی کے ناول نگار ایسا کررہے ہیں۔اکیس ویں صدی کے آغاز ہی سے دنیا میں ہندوستان اور پاکستان سمیت اُردو کی نئی بستیوں میں جس قدر ناول لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر نئے نئے موضوعات لیے ہوئے ہیں جس کی بنا پر ہم انہیں جدید اُردو ناول کے زمرے میں لاسکتے ہیں۔

نئے اُردو ناول کی تفہیم میں قرأت کے ساتھ ساتھ ناول کے تجزیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ کیوں کہ قاری ناول کے مطالعے میں اس کی تہ تک اس طرح نہیں پہنچ پاتا جس طرح ایک نقاد اس کی تہ میں اُتر جاتا ہے۔نقاد اس ناول کو پرت در پرت کھولتا چلا جاتا ہے اور وہ پہلو بھی سامنے لے آتا ہے جو قاری کی نظر سے پوشیدہ رہ گئے ہوتے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قاری کسی بھی ناول کا مطالعہ اپنے شوق، ذوق، وقت گزاری، معلومات کے لیے سرسری طور پر کرتا ہے جب کہ ایک نقاد کی مثال اس مشاق غوطہ خور کی طرح ہوتی ہے جو سمندر کی گہرائیوں میں جاتا ہے اور وہاں سے اس کے ہاتھ جو دُرِ نایاب لگتے ہیں وہ اس کی پہچان بھی بنتے ہیں اور اس کی آب و تاب اور چمک سے دوسرے افراد بھی استفادہ کرتے ہیں۔نقاد جب کسی ناول کے مطالعے میں غرق ہوجاتا ہے تو وہ ناول کی وہ سمتیں بھی دیکھتا ہے جو قاری کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔وہ اس کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتا ہے جو عام نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ایسے تجزیات قارئین و محققین کے لیے وہ مواد فراہم کرتے ہیں جن کی روشنی میں مزید مباحث کی گنجائش پیدا ہوتی ہے، جس سے تحقیق وتنقید کے نئے در وا ہوتے ہیں اور ان جہتوں کی نشان دہی ہوتی ہے جو بین السطور ہوتی ہیں

جن کے عمیق مطالعے ہی سے ان تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔

اچھے ناول اپنے زمانے کی تاریخ بھی ہوتے ہیں اور اس زمانے کی تہذیب و ثقافت کا آئینہ بھی۔ہر ناول میں اس عہد کی روایات اور رسوم و رواج اپنے تمام تر مثبت و منفی رویوں کے ساتھ موجود ہوتی ہیں جس سے اس دور کے اقتصادی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ادبی رجحانات کا واضح طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ایسے ناول نہ صرف تاریخِ اُردو ادب کا حصہ بنتے ہیں۔اُردو ادب کے وقیع سرمائے میں اضافہ ثابت ہوتے ہیں بلکہ اُردو ادب کے دامن کو مالا مال بھی کرتے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی ناول تمام مسائل و وسائل کا احاطہ نہیں کرسکتا، نہ تمام موضوعات کو کسی ایک ناول میں برتا جاسکتا ہے۔ناول نگار کی آنکھ بالکل کیمرے کے اس عدسے کی طرح ہوتی ہے جس میں نظر تو بے شمار مناظر اور اشیا آرہی ہوتی ہیں مگر کیمرہ مین جن چیزوں پر فوکس کرتا ہے وہی چیزیں تصویر میں منجمد ہوجاتی ہیں اور اس تصویر میں بھی وہ جس چیز کو زیادہ واضح کرنا چاہتا ہے وہی چیز اُبھر کر سامنے آتی ہے۔اس طرح ناول نگار بھی یہی کرتا ہے وہ جس موضوع کو فوکس کرتا ہے۔اس کے مطابق پس منظر اور کرداروں کو چنتا ہے پھر جن کرداروں کے ذریعے وہ اپنی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے انہیں کرداروں کو نمایاں کرتا ہے اور انہیں کے ذریعے اپنا مقصد اور نقطۂ نگاہ اور فلسفۂ حیات پیش کرتا ہے۔

جب ایک زیرک، فطین اور طبّاع نقاد ناول کا فنی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتا ہے تو اس کا تجزیہ نت نئے نکات و مباحث وجود میں لاتا ہے۔نقاد کی اس باریک بینی، یک سوئی اور عرق ریزی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی سوچ کے چراغ سے مزید چراغ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس فن میں اُجالا ہی اُجالا نظر آنے لگتا ہے۔جس سے نہ صرف قارئین، مشاہیر اور محققین استفادہ کرتے ہیں بلکہ ناقدین کے علم میں بھی وہ اضافے کا باعث بنتا ہے۔

یہاں ضمناً میں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ ناول کے فن، ہیئت، اُسلوب اور تحقیق وتنقید کی تحریریں پڑھنے ہی سے مجھے تحریک ملی اور میری راہ نمائی ہوئی اور میں ناول کی تنقید کی طرف راغب ہوسکا اور اپنے چند مضامین میں اپنے افکار و خیالات کا اظہار کرکے آپ تک ابلاغ کرنے کے قابل ہوا۔میں نے اپنے لیے اکیس ویں صدی کے اُردو ناول کو مختص کیا ہے کیوں کہ یہ صدی ناول کی صدی ہے (بہ قول پروفیسر گوپی چند نارنگ)

اس لیے میری کوشش بھی ہوگی کہ میں رواں صدی میں ناول کے فن، تحقیق، تنقیدی اور اُردو ناولوں کے تجزیے پر مشتمل چند کتابیں پیش کروں۔ اگر ناول کے متعلقین کی پسندیدگی کی سند ملتی رہی تو یہ کام جاری رہ سکتا ہے ورنہ اس سے ہاتھ کھینچا بھی جا سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں نئے اُردو ناول کے جدید موضوعات اور اس کے فکری و فنی پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی جائے۔ کیوں کہ جس ناول میں کوئی فکر شامل نہیں ہوتی وہ کوئی دوسری صنفِ ادب تو ہو سکتی ہے ناول نہیں۔ ناول نگار کا نقطۂ نگاہ یا فلسفۂ حیات ہمیں چیزوں کا روشن پہلو دکھاتا ہے اور ہمارے اذہان و قلوب کو ضیا عطا کرتا ہے جس کی روشنی میں ہم زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ناول نگار کا نقطۂ نگاہ اس قدر مضبوط اور ٹھوس ہوتا ہے کہ ہماری سوچ کو بدل دیتا ہے اور ہماری زندگی میں تغیرات رونما ہونے لگتے ہیں۔ کیوں کہ انسان اس کائنات کا مرکز و محور ہے اور زندگی انسان سے نسبت رکھتی ہے۔ انسان کی یہ زندگی عمومی طور پر اُلجھے ہوئے ریشم کے دھاگے نظر آتے ہیں جن کا سلجھانا دیکھنے میں انتہائی مشکل بلکہ ناممکن حد تک پیچیدہ نظر آتا ہے۔ مگر کوشش کرنے پر یہ ذرا سی محنت اور مہارت سے سلجھتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ناول نگار بھی ذرا سی محنت اور فن و ہنر کے سہارے زندگی کی تمام اُلجھی ہوئی گتھیاں اپنی کہانی میں کرداروں کے ذریعے سلجھا سکتا ہے۔ اس پیچیدہ اور جان لیوا عمل میں اسے جن مشکلات، کٹھن راستوں، ذہنی اذیت و کرب اور یہاں تک کہ ٹینشن سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ کوئی دوسرا تخلیق کار تو کر سکتا ہے مگر عام آدمی اس کی دھول بھی پا نہیں سکتا۔ وہ ناول کا ماجرا تشکیل دینے میں اس کرب کے جہان اور اذیت کی دنیا سے گزر جاتا ہے۔ اس لیے ناول نگار پہلے اپنی کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے کرداروں کا انتخاب کرتا ہے اور پھر ان کرداروں کے عمل و ردِعمل کے ذریعے اپنا نقطۂ نگاہ، حسین اُسلوب اور متاثر کن بیان میں پیش کرتا ہے کہ قارئین کے دل میں اس کی بات اُترتی چلی جاتی ہے۔ ناول نگار کی یہی بات، یہ حسنِ ادا اور کمالِ فن اچھے ناول کا جواز پیدا کرتا ہے۔ اچھے ناول میں ایک فکر کی دنیا، سوچ کی کائنات اور نئے افکار و خیالات کا جہان آباد ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وقت اور قاری سب سے اچھا نقاد ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ناول نگار سفلی خیالات اور رقیق جذبات سے کرداروں کے نقوش تو اُبھار سکتا ہے مگر قاری کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ قاری وقتی طور پر ایسی تحریر سے متاثر تو ہو سکتا ہے مگر فوراً ہی اس کے ذہن میں اس کے منفی اثرات آ جاتے ہیں اور وہ

اپنی منفی رائے ثبت کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ناول کے اختتام تک جانے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ اگر بالفرضِ محال قاری پورا ناول پڑھ بھی لے تو وہ سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید ہی کہتا نظر آتا ہے۔ اس کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔

نئے اُردو ناول کی تخلیق، تحقیق، تنقید اور تجزیے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ناول دوسرے اصنافِ ادب کے مقابلے میں اہم صنف ہے اور اس میں جس قدر موضوعات کو سمویا جا سکتا ہے کسی دوسری صنفِ ادب کے دامن میں اتنی وسعت نہیں ہے۔ نئے اُردو ناول کی تخلیق اور تنقید کو دیکھتے ہوئے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ناول وہ صنفِ ادب ہے جس کا ہمیشہ بول بالا رہے گا اور یقیناً نئے ناول نے وہ آواز بھی دبا دی ہے جو ''ادب رو بہ زوال'' کے نعرے کی شکل میں گونج رہی تھی۔ ان لوگوں کو بھی مایوسی کا شکار کر دیا ہے جو لوگ کہتے تھے کہ ادب پر جمود طاری ہو گیا ہے اور ان لوگوں کو بھی لاجواب کر دیا ہے جو کہہ رہے تھے کہ ناول اور اس کی تنقید کم لکھی جا رہی ہے بلکہ وہ لوگ بھی شکست خوردہ نظر آ رہے ہیں جنہوں نے ناول کے آخری سانس لینے کا اعلان کیا تھا۔ آج ناول کی تر و تازگی اور اس کی زندگی ان لوگوں کو بھی جھٹلا رہی ہے جنہوں نے ناول کی موت کا آوازہ بلند کیا تھا۔ ان لوگوں کی آواز بھی بیٹھ گئی جنہوں نے بہ بانگِ دہل نعرے لگائے تھے کہ ناول تو لکھے جا رہے ہیں مگر معیاری ناول سامنے نہیں آ رہے۔

اکیس ویں صدی میں جو ناول سامنے آئے ہیں ان میں زندہ ناول بھی ہیں اور معیاری بھی۔ وہ ناول نئے موضوعات کے حامل بھی ہیں اور جدید علوم و فنون سے آراستہ بھی۔ ان میں ناول نگاری کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ عناصرِ ترکیبی کے تمام عناصر اپنی بہاریں دکھا رہے ہیں۔ پلاٹ، کردار نگاری، پس منظر، نقطۂ نگاہ اور اُسلوبِ بیان اہم ستون کی حیثیت سے قائم ہیں۔ نئے اُردو ناول کی تفہیم میں اس لیے تاخیر ہوئی ہے کہ ابھی اکیس ویں صدی کا ابتدائی دور ہے صرف سترہ برس ہوئے ہیں، ان سترہ برسوں میں تقریباً 140 ناول تو شائع ہو گئے ہیں مگر ان کی تنقید پوری طرح لکھی نہیں گئی ہے، ان ناولوں کی پرتیں کھولنے میں ایک عرصہ درکار ہوگا۔ جیسے جیسے یہ قارئین کی قرأت میں رہیں گے اور ناقدینِ فنِ ناول ان کا تجزیہ پیش کرتے رہیں گے ویسے ویسے نئے اُردو ناول کے پہلوؤں پر روشنی پڑتی رہے گی اور ان کے عناصر اور محاسن کے تمام پہلو روشنی میں نہا کر آفتابِ تازہ کی مثل نہ صرف خود منور ہوں گے بلکہ ایک جہانِ تازہ کو منور

کر جائیں گے۔

اکیس ویں صدی میں چند ایسے ناول لکھے گئے ہیں جن کی پرتیں کھولنے کی ضرورت ہے۔ یہ معلومات کا خزانہ بھی ہیں اور ایک عہد کی تاریخ بھی۔ کچھ ناول ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو تنقیدی و تجزیاتی نقطۂ نظر سے جتنی بار بھی پڑھا جائے اتنی ہی چیزیں اس سے نکالی جا سکتی ہیں، ہر بار اس کا کوئی نہ کوئی نیا پوشیدہ پہلو سامنے آ جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے ناول پر ایک اور تنقیدی نظر کرنے کی ضرورت ہے، ایسے ناولوں کو بار بار کھنگالنے سے مزید گوہرِ نایاب ہاتھ لگتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اُردو ناول کی تحقیق و تنقید کا سلسلہ جاری و ساری رہنا چاہیے کیوں کہ یہ سلسلہ ایسا ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ناول لکھے جاتے رہیں گے اور ناول کی دریافت کا تسلسل قائم رہے گا۔ اگر ناول کی دریافت، اس کی تحقیق و تنقید سامنے نہ آتی تو آج نئے اُردو ناول کی جو نکھرتی ہوئی ہے وہ نہ ہوتی اور جو اس کا تر و تازہ چہرہ اور روپ سنگھار ہمارے سامنے موجود ہے وہ ایسا نہ ہوتا۔ ناقدینِ فنِ ناول نے ناول کے مجسمے کو انتہائی عرق ریزی، باریک بینی اور یک سوئی سے نکھارا ہے اور اسے تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر سنوارا ہے۔ اس کے بعد ہی تو خصوصاً ناول اور عموماً اُردو ناول نے پوری دنیا میں اپنے فکر و فن کی اہمیت کو تسلیم کروایا ہے۔

ادب کے نوبیل انعام کے ذکر سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ادب میں نوبیل انعام ایک تاریخ مرتب کر رہا ہے جس سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بہترین شاعری کیا ہے؟، وہ افسانے کون سے ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ دیگر اصنافِ ادب (اصنافِ نظم و نثر) میں ایسی کون کون سی اصناف ہیں جو عالمی سطح پر پسندیدگی کا ایوارڈ حاصل کرتی ہیں۔ وہ کون کون سے رائٹرز ہیں جو ذہین و فطین ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا ادب تخلیق کر رہے ہیں جو دنیا کی دیگر زبانوں میں پیش کیا جا سکتا ہے اور ان ادیبوں کی تحریروں کو عالمی سطح پر فخریہ اور مقابلتاً سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ہم نوبیل انعام کی فہرست کو سامنے رکھیں تو ہمیں خوش گوار حیرت کا سامنا ہوتا ہے کہ اب تک جتنے نوبیل انعام دیے جا چکے ہیں ان میں زیادہ تعداد ناول نگار ادیبوں کی ہے۔ ان ادیبوں کے ناولوں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور مغربی ادب میں ان کا اپنا ایک مقام اور منفرد نام ہے۔ ان ادیبوں کی فہرست دی جا رہی ہے جنھیں ادب کے نوبیل ایوارڈز ملے ہیں:

نوبیل انعام یافتہ رائٹرز

Nobel Prize in Literature

Kazuo Ishiguro	2017	(Novel)
Bob Dylan	2016	
Svetlana Alexievich	2015	
Patrick Modiano	2014	
Alice Munro	2013	
Mo Yan	2012	
Tomas Tranströmer	2011	
Mario Vargas Llosa	2010	
Herta Müller	2009	
Jean-Marie Gustave Le Clézio	2008	
Doris Lessing	2007	
Orhan Pamuk	2007	
Harold Pinter	2005	
Elfriede Jelinek	2004	(Novel)
John M. Coetzee	2003	
Imre Kertész	2002	
Sir Vidiadhar Surajprasad Naipaul	2001	
Gao Xingjian	2000	(Novel)
Günter Grass	1999	
José Saramago	1998	
Dario Fo	1997	
Wislawa Szymborska	1996	
Seamus Heaney	1995	
Kenzaburo Oe	1994	
Toni Morrison	1993	

Derek Walcott	1992	
Nadine Gordimer	1991	
Octavio Paz	1990	
Camilo José Cela	1989	
Naguib Mahfouz	1988	
Joseph Brodsky	1987	
Wole Soyinka	1986	
Claude Simon	1985	(Novel)
Jaroslav Seifert	1984	
William Golding	1983	(Novel)
Gabriel García Márquez	1982	(Novel)
Elias Canetti	1981	
Czeslaw Milosz	1980	
Odysseus Elytis	1979	
Isaac Bashevis Singer	1978	
Vicente Aleixandre	1977	
Saul Bellow	1976	
Eugenio Montale	1975	
Eyvind Johnson	1974	
Patrick White	1973	
Heinrich Böll	1972	
Pablo Neruda	1971	
Aleksandr Isayevich Solzhenitsyn	1970	
Samuel Beckett	1969	(Novel)
Yasunari Kawabata	1968	
Miguel Angel Asturias	1967	
Shmuel Yosef Agnon	1966	
Mikhail Aleksandrovich Sholokhov	1965	
Jean-Paul Sartre	1964	
Giorgos Seferis	1963	

John Steinbeck	1962	
Ivo Andric	1961	
Saint-John Perse	1960	
Salvatore Quasimodo	1959	
Boris Leonidovich Pasternak	1958	
Albert Camus	1957	
Juan Ramón Jiménez	1956	
Halldór Kiljan Laxness	1955	
Ernest Miller Hemingway	1954	
Sir Winston Leonard Spencer Churchill	1953	
François Mauriac	1952	(Novel)
Pär Fabian Lagerkvist	1951	
Earl (Bertrand Arthur William) Russell	1950	
William Faulkner	1949	(Novel)
Thomas Stearns Eliot	1948	
André Paul Guillaume Gide	1947	
Hermann Hesse	1946	
Gabriela Mistral	1945	
Johannes Vilhelm Jensen	1944	
Frans Eemil Sillanpaa	1939	
Pearl Buck	1938	
Roger Martin du Gard	1937	(Novel)
Eugene Gladstone O'Neill	1936	
Luigi Pirandello	1934	
Ivan Alekseyevich Bunin	1933	
John Galsworthy	1932	
Erik Axel Karlfeldt	1931	
Sinclair Lewis	1930	
Thomas Mann	1929	(Novel)
Sigrid Undset	1928	

Henri Bergson	1927
Grazia Deledda	1926
George Bernard Shaw	1925
Wladyslaw Stanislaw Reymont	1924
William Butler Yeats	1923
Jacinto Benavente	1922
Anatole France	1921
Knut Pedersen Hamsun	1920
Carl Friedrich Georg Spitteler	1919
Karl Adolph Gjellerup	1917
Carl Gustaf Verner von Heidenstam	1916
Romain Rolland	1915
Rabindranath Tagore	1913
Gerhart Johann Robert Hauptmann	1912
Count Maurice (Mooris)	
Polidore Marie Bernhard Maeterlinck	1911
Paul Johann Ludwig Heyse	1910
Selma Ottilia Lovisa Lagerlöf	1909
Rudolf Christoph Eucken	1908
Rudyard Kipling	1907
Giosuè Carducci	1906
Henryk Sienkiewicz	1905
Frédéric Mistral	1904
Bjørnstjerne Martinus Bjørnson	1903
Christian Matthias Theodor Mommsen	1902
Sully Prudhomme	1901

◆◆◆

ناول اور اِس کی تنقید

کسی بھی صنفِ ادب کی تنقید لکھی جانے کا مطلب ہے کہ اس صنفِ ادب کو سنوارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کوئی بھی نقاد جب کسی صنف پر بات کرتا ہے تو اس کی تنقید کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس صنف یا عبارت کے تمام محاسن اور تمام معائب کھل کر اُجاگر کرے۔ محاسن کی تعریف اور مصائب کی نشان دہی کرے۔ اس کو غیر جانب دار تنقید کہا جاتا ہے۔ ایک اچھا نقاد غیر جانب دار ہوکر تحریر پڑھتا ہے اور موضوع کے لحاظ سے اس کا کلی جائزہ لے کر جب اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو اس میں تحریر کے محاسن کے ساتھ ساتھ اس میں پائے جانے والے معائب بھی بیان کرتا ہے۔ وہ تحریر کے نقائص کو دور کرنے کے اقدامات بھی کرتا ہے اور تعمیری تنقید سے ان مسائل کا حل بھی بتاتا ہے۔

ناول کی تنقید کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تاریخ، ارتقا اور فن و عناصرِ ترکیبی پر بصیرت افروز مقالے لکھے جائیں جو آنے والی نسلوں کے لیے بھی مشعلِ راہ ثابت ہوں اور قارئینِ ادب، ناقدینِ فن اور مشاہیرِ اُردو ادب کے ساتھ ساتھ طالب علموں، دانش وروں اور اسکالروں کے لیے بھی راہ نما بنیں۔ ایک زمانہ تھا کہ کہا جاتا تھا کہ ناول کی تنقید نہ ہونے کے برابر لکھی جارہی ہے مگر اب یہ شکایت دور ہوگئی ہے کیوں کہ آج ناول کی تنقید کا سرمایہ اچھا خاصا جمع ہو گیا ہے۔ آغاز میں کہا جاسکتا تھا کہ ناول کی تنقید پر زیادہ مواد نہیں ملتا تھا۔ مگر جس قدر ناول سامنے آتے گئے ان کی تنقید بھی لکھی جاتی رہی۔ اکیس ویں صدی تک جہاں اُردو ناول زیادہ لکھے گئے ہیں وہاں ان کی تنقید پر دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں آیئے ان کتابوں کی فہرست ملاحظہ کرتے ہیں جو

ناول کی تنقید پر لکھی گئی ہیں:

ناول کی تنقیدی تاریخ	محمد احسن فاروقی
ناول: فن اور تکنیک	محمد احسن فاروقی
ناول کیا ہے؟	محمد احسن فاروقی
ناول اور ناول نگار	علی عباس حسینی
ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی
اُردو ناول اور آزادی کے تصورات	پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف
آزادی کے بعد اُردو ناول	ڈاکٹر اسلم آزاد
اُردو کے پندرہ ناول	اسلوب احمد انصاری
ہندو پاک میں اُردو ناول	ڈاکٹر انور پاشا
اُردو ناولوں میں ترقی پسند عناصر	ڈاکٹر حیات افتخار
اُردو ناول میں تصوف کی روایت	ڈاکٹر رضا احمد
اُردو میں تاریخی ناول	ڈاکٹر رشید امجد
اُردو ناول نگاری	سہیل بخاری
اُردو ناول میں طنز و مزاح	شمع افروز زیدی
اُردو ناول: آغاز و ارتقا	عظیم الشان صدیقی
قرۃ العین حیدر اور اُردو ناول کا جدید فن	ڈاکٹر عبدالسلام
فنِ ناول نگاری	ڈاکٹر عبدالسلام
اُردو ادب میں عورت کا تصور	فہمیدہ اکبر
اُردو ناول میں سماجی شعور	ڈاکٹر محمد افضال بٹ
اُردو ناول کا سفر	ڈاکٹر مظفر عباس
(ہیئت، اسالیب اور رجحانات، ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۷ء)	
اُردو ناول کے بدلتے تناظر	ڈاکٹر ممتاز احمد خان

ناول کے ہمہ گیر سروکار	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
آزادی کے بعد اُردو ناول	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
اُردو ناول (کرداروں کا حیرت کدہ)	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
اُردو ناول کے چند اہم زاویے	ڈاکٹر ممتاز احمد خان
اکیس ویں صدی میں اُردو ناول	مرتب: ڈاکٹر نعیم انیس
اُردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات	ڈاکٹر محمد عظیم اللہ
اُردو ناول: تاریخ و ارتقا (آغاز سے اکیس ویں صدی تک)	ڈاکٹر محمد اشرف کمال
پانچ ناول......تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد اشرف کمال
برصغیر میں اُردو ناول	ڈاکٹر خالد اشرف
نئی صدی۔ نئے ناول (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)	غفور احمد
پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول	ڈاکٹر نجمہ صدیق
بیس ویں صدی میں اُردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست

ناول کے ناقدین نے جو تنقیدی مقالات پیش کیے ہیں ان کا تعلق انیس ویں صدی سے ہے اور ایسے مقالات کی روشنی ہی میں ادبی نظریات متعین ہوئے ہیں۔ ان فنی نظریات کی ترقی یافتہ شکل ہمیں آج کے اکثر ناولوں میں نظر آ رہی ہے۔ ناول میں منتشر خیالات کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ بے ترتیب واقعات کو ترتیب وار کر دیا گیا ہے۔ کرداروں کی مناسبت سے پس منظر پیش کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ناول میں حسنِ خیال، ندرتِ افکار کے ساتھ ساتھ جمالیاتی رو پیدا ہو گئی ہے۔ آج کے اُردو ناول میں حسین حادثات بھی پیش کیے جا رہے ہیں اور دل فریب واقعات بھی۔ دل کش مناظر اور دیدہ زیب نظاروں سے اسے زینت بھی دی جا رہی ہے۔ دوسری طرف زندگی کی سچی تصویر ناول کے ذریعے پیش کی جا رہی ہے، معاشرے میں رواج پانے والی برائیوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے اور خرابیوں کو اُجاگر کیا جا رہا ہے تاکہ ان برائیوں کو ختم کیا جا سکے اور خرابیوں کو سدھارا جا سکے۔ کسی بھی تحریر کے لیے تنقید کا عمل جراحت کی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح ایک سرجن پورے انسانی جسم کو درد و تکلیف سے بچانے کے لیے آلاتِ

جراحت سے کام لے کر اس جسم کے زخموں کا علاج کرتا ہے اور انسانی جسم کو صحت و تن درست کر دیتا ہے۔ اسی طرح ناول کی خامیوں، خرابیوں اور برائیوں کو دور کرنے کے لیے ایک نقاد سرجن کا کام کرتا ہے۔ اس فن پارے کی خامیاں اور خرابیاں نہ صرف بیان کر دیتا ہے بلکہ ان کا علاج بھی دریافت کرتا ہے اور اسے قابلِ عمل بنانے کے لیے تدابیر و اقدامات بھی کرتا ہے۔ نقاد ایک زیرک، ذہین اور طباع ہوتا ہے جو حاذق طبیب کی طرح تحریر کے امراض یعنی جھول، معائب اور نقائص جان لیتا ہے اور پھر اُن کی تعمیری اصلاح کے لیے مشورے دیتا ہے جس پر عمل سے ناول صحت منداور تن درست ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی تحریر سے جو قاری ملتا ہے وہ ہشاش بشاش نظر آتا ہے اور اسے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے کہ آج کا اُردو ناول اس کے معاشرے کی نمائندگی اور زندگی کی ترجمانی کر رہا ہے۔

آج کے اکثر ناول میں ناول نگار اپنی تخلیق میں زبان و بیان کے کرشمے بھی دکھا رہا ہے اور کرداروں کے کمالات بھی۔ وہ پس منظر کی نمائش بھی کر رہا ہے اور اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت بھی۔ اس کا اُسلوبِ بیان سیدھا سادا بھی ہے اور مکالموں کی پرکاری سے مزین بھی۔ مگر انیس ویں صدی کے آغاز میں اکثر ناول کے خلاف کچھ لوگوں نے نعرے بازی کی جن میں قدامت پسندی، مذہبی اور جانب دار نقاد شامل تھے۔ ایک محاذ آرائی کی سی صورتِ حال تھی جس میں اعتراضات بھی شامل ہو رہے تھے اور ان کے جوابات بھی۔ کچھ اعتراضات پیشِ خدمت ہیں:

۱۔ ناول نوجوان طبقے کا وقت ضائع کر رہا ہے۔
۲۔ یہ وقت گزاری کی چیز ہے۔
۳۔ سستی تفریح کے زمرے میں آتا ہے۔
۴۔ انسان کو خیالی دنیا کا مکین بناتا ہے۔
۵۔ عملی زندگی سے دور کرتا ہے۔
۶۔ انسانوں کا اخلاق تباہ کر رہا ہے۔
۷۔ انسان کے کردار کی منفی تعمیر کرنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔
۸۔ انسان کی معاشی حالت تباہ کر رہا ہے۔

۹۔ آخرت بھی خطرے میں ڈال رہا ہے۔
۱۰۔ ناول ایک خیالی پلاؤ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔
۱۱۔ ناول کسی منفرد حیثیت کا حامل نہیں ہے۔
۱۲۔ ناول ایک نشہ آور گولی ہے۔
۱۳۔ ناول کے زیرِ اثر قارئین طلسمی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔
۱۴۔ ناول نچلے درجے کے لوگوں کے لیے سستی تفریح ہے۔
۱۵۔ ناول اخلاقی اعتبار سے پست ہوتا ہے۔
۱۶۔ ناول میں آفاقی حقائق نہیں ہوتے اس لیے یہ عظیم ادب نہیں ہے۔
۱۷۔ ناول میں داخلی کیفیات کی ٹھیک ترجمانی نہیں ہو سکتی۔
۱۸۔ ناول نگاری آسان ہے اسی لیے ہر آدمی ناول لکھ دیتا ہے۔
۱۹۔ ناول سے اعلیٰ خیالات و جذبات کی عکاسی ممکن نہیں۔

ناول پر یہ اعتراض ہوئے تو معاشرے کے افراد پر ان کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ ایک طرف تو والدین کی کوشش رہنے لگی کہ اپنی اولاد کو اس ناول کی قرأت سے دور رکھا جائے یا ناول کے مطالعے سے باز رکھیں۔

دوسری طرف ان اعتراضات کا اثر ان کے برعکس ہونے لگا۔ ناول کی قرأت میں اضافہ ہوا، اور ناول کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ اب حلیفوں کے ساتھ ساتھ ناول کے حریف بھی اس کی حمایت میں آنے لگے۔ سخت مخالفت کرنے والے گوشہ نشین ہو گئے اور ناول پر اعتراض سے ہاتھ کھینچ لیا گیا۔ ناول کی تعریف ہونے لگی اور مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا تو دیگر فکشن نگاروں کے حوصلے بڑھے، اکثر افسانہ نگاروں نے ناول کی طرف توجہ دی اور بہت اچھے اچھے ناول تخلیق کیے۔ اسی طرح ناول سے اُردو ادب کا دامن مالا مال ہونے لگا۔ خواص کے ساتھ ساتھ یہ عوام میں بھی رائج ہو گیا۔ انیس ویں صدی کے آخر تک ناول اور اس کی تنقید دیگر اصنافِ ادب کی تنقید پر اگر سبقت نہیں لے گئی تو اس کے مدِ مقابل ضرور آ کھڑی ہوئی۔ جہاں ناول مختلف موضوعات پر لکھے جانے لگے وہاں اس کی تنقید پر مضامین بھی ادبی حلقوں میں پڑھے جانے لگے اور ادبی رسائل و

جرائد میں باقاعدگی سے نہ صرف شائع ہونے لگے بلکہ ان پر بحث ومباحثے کا دور بھی چل نکلا۔ بسا اوقات تو یہ بھی ہوا کہ کوئی ناول نیا شائع ہوا تو اس کی قرأت کا گراف نا قابلِ ذکر رہا مگر جب اس پر تنقیدی مضامین شائع ہوئے تو اس ناول کی تفہیم کے پہلو سامنے آئے اور اس ناول کی قرأت کا گراف بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔

جس طرح اُردو ادب کے جید نقاد عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا تھا کہ ہندوستان کی دو کتابیں مستند ہیں، ایک ''وید مقدس'' اور دوسری ''دیوانِ غالب''۔ اس تنقیدی رائے کے بعد غالب کو جتنا پڑھا گیا اس کی مثال دینا ممکن نہیں۔ اسی طرح اُردو ادب میں قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' اور اسی قسم کے دیگر ناولوں پر تنقید کی گئی تو ان کی مناسب تفہیم ہو سکی اور وہ اُردو ادب کے نمائندہ ناول بن گئے۔ ناول کے ناقدین میں ڈاکٹر احسن فاروقی، عباس جلال پوری اور ممتاز احمد خان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو ناول کو ایسے ناقدین نے اپنی تنقید کے کمالات سے اعتبار بخشا، قبولیتِ عام دی، شہرتِ دوام بخشی۔ ناول اور اس کی تنقید کے ان نقادوں نے جب سنجیدگی اور پختہ خیالی سے ناول کی حمایت کی اور اس کی تنقید کا مقدمہ لڑا اور وکالت شروع کی تو اس کی عظمت اور شہرت کی دھاک قارئین کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ ناول اور اس کی تنقید پر کمر بستہ نقادوں نے خیال پیش کیا کہ ناول کے عناصرِ ترکیبی کا عمدہ استعمال، جدید علوم، رسوم و رواج اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کے موضوعات نے ناول میں ایک جامعیت پیدا کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کے نئے اُردو ناول میں خارجی و داخلی معاملات کی ترجمانی بھرپور انداز میں کی جا رہی ہے اور ہم اسے کسی بھی دوسری صنفِ ادب کے مقابل لا سکتے ہیں بلکہ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ناول میں انسان اور اس کی زندگی کی سچی تصویریں پیش کرنے کے لیے ناول سے زیادہ مناسب کوئی دوسری صنفِ ادب نہیں ہے۔ اس میں دوسرے اصنافِ ادب کے مقابلے میں اظہار و ابلاغ بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ ناول کی اسی خوبی نے اسے دیگر اصنافِ ادب میں منفرد و ممتاز کر دیا ہے۔ کیوں کہ آج کے نئے اُردو ناول میں کیا چیز ہے جو اس کا حصہ نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے کی تصویر، عہدِ موجود کی عکاسی، معاشرے کے رسوم و رواج، تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، نازک خیالات، دلی محسوسات، تصورِ کائنات، نظامِ دنیا، اجرامِ فلکی، زمین و آسمان کی آفاقیت، دل میں پیدا ہونے

والے ہر خیال کا بہ آسانی ابلاغ ناول ہی کے ذریعے ممکن ہو سکا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ متعدد موضوعات ہونے کی بنا پر ناول کو خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے یعنی جاسوسی ناول، ادبی ناول، معاشرتی ناول، سائنسی ناول، بچوں کے ناول، سماجی ناول، تفریحی ناول، رومانی ناول اور جنسیاتی و نفسیاتی ناول۔ یہ بات بھی ناول کے کریڈٹ میں جا رہی ہے کہ موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے اس کا دائرہ پھیلتا چلا جا رہا ہے اور اس میں مزید موضوعات کے سمانے کی گنجائش نکلتی جا رہی ہے۔ اس سبب ناول کے قارئین میں بھی اضافہ ہو رہا ہے کیوں کہ مختلف موضوعات پر پڑھنے والوں کی تعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔

انگریزی ادب کے ایک نقاد نے بڑی صراحت کے ساتھ ناول کو شاعری کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اس کے ثبوت میں کہا ہے کہ ناول اور شاعری دونوں کی بنیاد تخیل ہے۔

جہاں تک نئے اُردو ناول کا تعلق ہے کہ اس ضمن میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آج کے نئے اُردو ناول میں انسان کے کردار کی تعمیر کرنے، معاشی حالت بہتر بنانے، عافیت سنوارنے، دنیا مستحکم کرنے، خیال سے حقیقت تک سفر کرنے، زندگی کی سچی تصویر پیش کرنے، نئے علوم کو بیان کرنے، جدید سائنسی ترقی سے فائدہ اُٹھانے، آفاقی حقائق کا بیان کرنے، داخلی و خارجی کیفیات کی ترجمانی کرنے، اعلیٰ خیالات و جذبات کی عکاسی کرنے اور معاشرے کو سدھارنے کے عوامل شامل ہیں۔ صرف شرط قاری کے مثبت ذہن کی ہے کیوں کہ چھری بنانے کا مقصد سبزی و گوشت وغیرہ کی قطع و برید کرنا تھا مگر منفی ذہن کے لوگ چھری کو آلۂ قتل کے طور پر استعمال کر کے قتل بھی کر دیتے ہیں۔ یہ منفی سوچ ہے کہ ایک مثبت شے سے منفی کام لیا گیا ہے۔ اسی طرح ناول کا کام اصلاحِ معاشرہ بھی ہے اور اخلاق و کردار کی تعمیر بھی، مگر کوئی منفی ذہن قاری اس سے اُلٹا اثر لے تو نہ اس میں ناول نگار کا قصور ہے اور نہ ناول کی تحریر کا۔ کیوں کہ ناول نگار نہ صرف عام سی زندگی کی ترجمانی کرتا اور نہ صرف خوشی و غمی کے واقعات سے کہانی کا تانا بانا بنتا ہے بلکہ گہرائی میں جا کر خیر و شر کے مسائل سے لے کر بنیادی اور آفاقی حقائق کا بھی انکشاف کرتا ہے۔ ناول میں متعدد موضوعات پر لکھا جا رہا ہے اس لیے مختلف کرداروں کے ذریعہ رموزِ کائنات، اسرارِ زندگی اور مسائلِ سماج کو پیش کرنے کی گنجائش ہے۔ اب ناول نگار کی فن کاری

اور مہارت ہے کہ وہ ان واقعات کو کس قدر سچائی، عمدگی اور سلیقہ مندی سے پیش کرتا ہے اور اپنے ناول کو معرکہ آرا تصنیف بناتا ہے۔

ناول کو شہرت دینے اور بقائے دوام بخشنے میں ناول کی تنقید کا بڑا ہاتھ ہے اور یہ سارا کریڈٹ ناول کے ناقدین کو جاتا ہے۔ جنھوں نے ناول کی تنقید غیر جانب داری کے ساتھ لکھی، اس کے محاسن کو بیان کیا اور معائب کی نشان دہی کی۔ جس سے ناول نگاروں کی اصلاح ہونے لگی۔ تعمیری تنقید سے ناول کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش ہونے لگی اور محاسن کو اپنایا جانے لگا۔ یوں ناول سے خرابیاں دور ہو کر محاسن کی تعداد حاوی ہو گئی اس سے ناول میں سدھار اور مزید نکھار پیدا ہو گیا۔ لہٰذا ناول نگاروں کی تحسین ہونے لگی تو اس حوصلہ افزائی نے انھیں ناول کے نئے نئے موضوعات پر لکھنے کی دعوت دی۔ ناول نگاروں نے جدید علوم، تغیراتِ دنیا، امتدادِ زمانہ اور افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ نت نئے رجحانات اور تبدیل ہوتے میلانات کو موضوع بنا کر ناول لکھے۔ اس طرح فکشن نگاروں نے بھی ناول نگاری کی طرف رخ کیا اور اسی جانب توجہ دی۔ جب ناول نگاروں کی تعداد بڑھی تو فطری بات تھی کہ ناولوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور متنوع موضوعات پر بنی ناول شائع ہونے لگے۔ ان موضوعات میں سائنسی ایجادات، نئے علوم و فنون، جدید ٹیکنالوجیاں، فنِ جراحت، نفسیاتی مسائل، بے راہ روی، عورتوں پر مظالم، جنسی تشدد، عورتوں کو جلانا، ننگا کر کے بازار میں پھرانا، قرآن سے شادی کرانا، کاروکاری میں مار دینا، غیرت کے نام پر قتل کرنا، معاشرے کے بدلتے رسوم و رواج، تہذیب و ثقافت اور صنعت و حرفت و تجارت کے ساتھ سیاسیات، معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات، تاریخی، اسلامی، اخلاقی اور ادبیات کے موضوعات پر بے شمار ناول لکھے گئے۔

ان حقائق سے ہم آج کے اُردو ناول کو نہ صرف نیا کہہ سکتے ہیں بلکہ جدید اُردو ناول کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ کیوں کہ آج کل ناول کے ذریعے رموزِ زندگی کو افشا کیا جا رہا ہے، اسرارِ کائنات کھولے جا رہے ہیں، ستاروں کے علم پر لکھا جا رہا ہے۔ حیات و کائنات کی تفسیر و تشریح کی جا رہی ہے۔ حسن و عشق کے قصے موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق پیش کیے جا رہے ہیں۔ تاریخی ناول لکھے جا رہے ہیں۔ حکومتوں اور حکمرانوں کے عروج و زوال کی داستانیں اور ان کے

اسباب بیان کیے جا رہے ہیں۔ اس سے یہ ناول اپنے زمانے کی تاریخ بھی ہیں اور اُردو ادب کا وقیع سرمایہ بھی۔ انسانی معاشرے کے رسوم و رواج کی دستاویزات بھی ہیں اور اپنے عہد کا نوحہ بھی۔ نئے ناول میں ایک اور خوبی موجود ہے کہ یہ جمالیاتی اور تاثراتی فضا رکھتے ہیں۔ اب نئے ناول میں پورے معاشرے کو سامنے رکھنے کو ثانوی حیثیت حاصل ہے جب کہ اوّلیت ایک فرد کی زندگی اور انسانی زندگی کے نشیب و فراز پر دی جاتی ہے۔ ایک فرد کی زندگی میں ہزارہا واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اسے بے شمار حادثات و سانحات سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ انبوہِ کثیر رنج و غم، دکھ درد، مصائب و آفات سے گزرا ہوتا ہے۔ اس نے بے شمار صدمات برداشت کیے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایک اچھا ناول نگار ایک فرد اور اس کی زندگی کی جزیات نگاری بہتر کر سکتا ہے۔ اس کی ایک ایک بات، ایک ایک واقعے اور ہر ہر پہلو کو کھول کر بیان کر سکتا ہے۔ زندگی کی یوں سچی تصویر دیکھ کر قاری کو مانوسیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اسے بھی جانتا ہے جو کردار اس کے سامنے موجود ہے اور اس زندگی کو بھی برتا ہوا ہے جو اس میں دکھائی جا رہی ہے۔ وہ زندگی کی تلخیوں سے بھی واقف ہے اور شیریں لمحات کی چاشنی کا ذائقہ بھی اسے یاد ہے۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بھی شناسا ہے اور اس کے نشیب و فراز سے بھی واقف ہے۔ لہٰذا قاری کو کسی بھی موڑ پر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ سبھی کچھ اس کے مشاہدات اور تجربات بیان کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ مگر ناول نگار کی ریاضت اور فن یہاں نظر آنا چاہیے۔ اس کی علمی صلاحیت اور تعلیمی قابلیت کا احساس ہونا چاہیے۔ اس کی کہانی پر گرفت کا پتا چلنا چاہیے۔ ناول نگار کی اس مہارت سے قاری کو احساس ہوگا کہ اس نے عام انسانی زندگی کے وہ گوشے بھی ہنر مندی سے پیش کیے ہیں جس کا اسے علم نہیں تھا۔ زندگی کے وہ مناظر بھی دکھائے ہیں جو اس کی نظر سے پوشیدہ تھے۔ معاشرے کے وہ کردار بھی سامنے لایا ہے جسے اس نے ابھی تک پہچانا نہیں تھا۔ زندگی کے کچھ پہلو یا مناظر جب انسان کے سامنے آتے ہیں تو وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ چونکانے کا عمل ہی ناول کی انفرادیت ہے جو اسے یکسانیت سے الگ کرتی ہے۔ انسان دوستی اور انسان کے درمیان دشمنی سے جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ ناقابلِ فراموش اس لیے بھی بن جاتے ہیں کہ ان میں سے اکثر فطرت کے خلاف باتیں سامنے آتی ہیں۔ فطرت کے برعکس کبھی کبھار عوامل و عناصر سامنے آتے ہیں جو یا تو کرشمے کہلاتے ہیں یا

پھر بربریت اور پُرتشدد کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔اس قسم کے واقعات، قتل وغارت گری، عشق و محبت اور جنگ وجدل میں سامنے آتے ہیں۔

نیا اُردو ناول میں نئے لکھنے والوں کی عبارت کے کرشمے بھی سامنے آئے ہیں کہ انھوں نے انسانی متعلقات اوراس کی زندگی سے وابستہ اشیا کی جزیات نگاری اس طرح کی ہے کہ اس کے داخلی اور خارجی پہلو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں اور نئے لکھنے والے اس طرزِ ادا میں حد درجہ کام یاب وکامران ٹھہرتے ہیں۔ جہاں نئے لکھنے والے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کا ناول نئے موضوع پر مبنی ہو، انسان اوراس کی زندگی کے واقعات کو مرکز ومحور بنایا گیا ہو۔ جزیات نگاری اس انداز سے کی گئی ہو کہ زندگی کی سچی تصویر سامنے آجائے۔اس طرح ایک قاری کے ذہن میں بھی یہ بات ہوتی ہے کہ اگر ناول رومانی ہے تو اس میں رومانی عناصر حقیقت سے قریب تر ہوں، ان میں اَن ہونی باتوں کو عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہو، غیر یقینی صورتِ حال کو نبھایا گیا ہو، خلافِ فطرت اعمال وافعال کی مذمت ادبی انداز میں کی گئی ہو، اور ایسے نتائج نکالے گئے ہوں کہ قاری کے دل ودماغ پر ایسے اثرات مرتب ہوں کہ آئندہ وہ ایسے خلافِ فطرت واقعات کے ظہور پذیر ہونے میں سدِ باب کرنے کا اہتمام کرے اور خود کو اچھا انسان بنائے۔ناول نگار کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ناول نگاری کے ذریعے اپنے نظریات اور نقطۂ نگاہ تو بڑی آسانی اور موَثر انداز میں پیش کر دیتا ہے اور اپنے مقاصد حاصل کر لیتا ہے۔ایک ناول نگار کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ان عناصر وعوامل کو بھی ناول میں بیان کرے جن کی قاری کو تشویش رہتی ہے۔ جس طرح ایک اچھا شاعر اپنی آفاقی شاعری کی بنیاد ندرتِ خیال اور جدید طرزِ ادا پر رکھتا ہے مگر وہ کسی بھی صورت میں اپنا ناتا روایت سے توڑتا نہیں ہے وہ روایت کی پاس داری کرتے ہوئے جدت کا دامن تھامتا ہے۔لہٰذا اس کی شاعری کو ہم روایت اور جدت کے امتزاج کا حسین سنگم کہتے ہیں۔

اسی طرح کوئی بھی ناول نگار کسی بھی موضوع پر ناول لکھے مگر اس کی بنیاد انسان دوستی اور عشق ومحبت پر رکھتا ہے۔رومانی عناصر کی آمیزش سے ناول میں دل کشی اور جاذبیت پیدا کی جاتی ہے۔مگر ان کا مرکز ومحور وہی موضوع رہتا ہے جس پر ناول کی عمارت تعمیر کی جارہی ہوتی ہے۔

کہیں کہیں رومانویت سے اسے زینت دی جاتی ہے۔جس سے لطیف احساس پیدا ہوتا ہے۔یہ رومانویت ہمارے اُردو فکشن کے لیے لازم وملزوم ہے۔اتنا ضرور ہے کہ کسی ناول نگار نے رومان کو حقیقت پر اور کسی نے حقیقت کو رومان پر ترجیح دی ہے۔مگر جب ناول نگار فطرت کی عکاسی اور زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرتا ہے ہمیں اس کی فکری پرواز اور تخیل کی ندرت کا اندازہ ہوتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اپنی عمارت کی تعمیر میں بنیاد کس قدر پختہ رکھی ہے۔ رومان اور حقیقت نگاری عناصر ہیں مگر مافوق الفطرت اور غیر مرئی مخلوق کی کہانیاں ہمیں خواب و خیال کی دنیا کی سیر تو کراتی ہیں اور رنگین ودل چسپ محسوس بھی ہوتی ہیں مگر ان کا اثر وقتی ہوتا ہے۔رومان اور حقیقت کے اثرات دیر پا ثابت ہوتے ہیں۔ایسے اثرات انسان کی زندگی بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اگر کوئی کہانی یا اس کا کلائمکس انسان کے ذہن ودماغ پر اثر انداز ہو جائے تو اس کے خیالات بدل دیتا ہے اوراس کی زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے جس سے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ناول نگار اپنی تحریر کے لیے کوئی بھی انداز اپنائے، چاہے وہ تجرید کا پیکر عطا کرے یا علامت کے پیرائے میں لکھے یا بیانیہ اندازِ تحریر اپنائے مگر ہر زاویے سے اسے حقیقت کے دامن کو تھامے رکھنا ہوگا۔وہ کسی موڑ پر حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ناول نگار کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ قاری اس کی تحریر کو جھوٹ کا پلندہ نہ سمجھے، کہ اسے کسی دوسری یا تیسری دنیا کی کہانی تصور نہ کرے، نہ اس کی کہانی میں پیش کیا گیا ماحول خلائی نظر آئے۔ناول نگار اسی لیے انسان اوراس کی زندگی کو بنیاد بنا کر کہانی لکھتا ہے اوراسی روشنی میں آگے بڑھتا ہے جس سے اس کے ناول میں حقیقت کا رنگ اور اصلیت کا روپ اُبھرنے لگتا ہے۔یہ کسی بھی ناول کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ناپختہ تجربات، ناقص خیالات، غیر مربوط واقعات، بے کیف مشاہدات، غیر ضروری تفصیلات، حقیقت نگاری کے زمرے میں نہیں آتیں۔ خارجی علائم، داخلی محرکات، جزویات نگاری، اہم اور ضروری باتوں کو اور بڑے واعلیٰ واقعات کو ترتیب سے پیش کرنے کا تعلق حقیقت نگاری سے ہے۔انسان کے تلخ وشیریں تجربات، عمیق مشاہدات، شدید جذبات (غصّہ، نفرت، ڈر، محبت اور غم وخوشی) کو آفاقی انداز میں پیش کرنا حقیقت نگاری کہلاتا ہے۔ایسی تحریر جس میں ناول نگار کا تخیل بالکل آزاد ہو، اس نے جو زندگی

کے تجربات اور عمیق مشاہدات سے سیکھا ہو یا کشید کیا ہو، وہ اسے عمدہ انداز میں بیان کرے۔ زندگی کی داخلی یا خارجی کیفیات کے بیان کے لیے ایسی تکنیک اختیار کرے جو زوداثر بھی ہو اور دیرپا اثر بھی۔ ایک کام یاب ناول نگار وہ کہلاتا ہے کہ جس نے اپنے ناول میں جو کچھ دکھایا ہو وہ سبھی کچھ قاری کو بھی نظر آ جائے۔ جو ناول نگار نے محسوس کیا ہو اس کا احساس ہر قاری کو ہو جائے اور ناول نگار نے جو اپنا نقطۂ نظر ناول میں سمویا ہو، وہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہو۔ جو ناول نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جس قدر حقیقت کا رنگ بھرتا ہے اس کی تحریر اسی قدر بہتر، زوداثر اور بُنت کے لحاظ سے عمدہ نظر آتی ہے۔ جس طرح ہم آئینے میں براہِ راست اپنا صاف وشفاف اور واضح عکس دیکھتے ہیں اور خود پر غور کرتے ہیں، یہ مشاہدہ ہمیں بہت بھلا اور سچا لگتا ہے۔ اسی طرف ناول ایک صاف وشفاف آئینہ ہے جس میں زندگی کا عکس جس قدر صاف و شفاف اور واضح نظر آئے گا اس کا اعتبار اسی قدر قائم ہو سکے گا۔ یہ الگ ہے کہ ہر ناول نگار زندگی کو اپنی خاص نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے جن پہلوؤں پر اس کی توجہ مرکوز ہوتی ہے وہی اس کے بیان میں زیادہ آتی ہیں۔ ناول نگار فطری طور پر ان باتوں کو تفصیل اور زیادہ لگن سے بیان کرتا ہے جس کو وہ اپنے لیے اہم اور ضروری سمجھتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ہمیں شاعری، مصوری اور ناول نگاری ایک جیسے فن نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ شاعر اپنے تجربات کو الفاظ کے سہارے منظوم انداز میں پیش کرتا ہے۔ مصور اپنے عمیق مشاہات کو رنگوں کے ذریعے اور برش کی مدد سے قرطاس پر پینٹ کر کے اپنا مدعا بیان کرتا ہے اور ناول نگار اپنے احساسات کو الفاظ کے سہارے نثری صورت میں عوام کے سامنے لاتا ہے۔ تینوں شخصیات شاعر، مصور اور ناول نگار کا انداز الگ الگ ہے مگر اپنی بات کے ابلاغ کے لیے مختلف پیرائے اختیار کیے ہوتے ہیں۔ جس طرح شاعری کے ذریعے پیغامات کا ابلاغ بہ آسانی ہو جاتا ہے اسی طرح مصوری کے ذریعے رنگوں کی زبان سمجھنے والے لوگ بھی پیغام جان لیتے ہیں۔ یہی صورت حال ناول کی ہے۔ ناول نگار اپنا نقطۂ نظر اپنی تحریر میں سمو دیتا ہے اور ایک کہانی کی شکل میں کرداروں کی مدد سے اپنی بات کا ابلاغ کرتا ہے جو قارئین تک بہ آسانی ابلاغ ہو جاتا ہے۔ اس کام یاب ابلاغ کی وجوہات واقعات کی عمدہ ترتیب، پُر اثر پس منظر، مناسب کردار، واضح نقطۂ نظر اور بہترین اُسلوبِ بیان ہیں کسی بھی تخلیق

میں اس کے تخلیق کار کی ذاتی دل چسپی کا بڑا حصہ کارفرما ہوتا ہے۔

ناول نگاری کے ضمن میں ایک بات نہایت قابلِ توجہ ہے کہ ہر ناول نگار کو اس کی زندگی میں تلخ و شیریں تجربات بھی ہوتے ہیں اور عمیق مشاہدات بھی، وہ نازک احساسات سے بھی گزرتا ہے اور شدید جذبات کا شکار بھی ہوتا ہے۔ مگر ان سبھی واقعات کی روداد، سرگزشت اور داستان اس کے لاشعور میں محفوظ تو ہوتی ہے مگر بے ترتیب۔ احساسات، تجربات اور مشاہدات کی تصویریں اُلٹ پلٹ کر سامنے آتی ہیں۔ واقعات آگے پیچھے گھوم جاتے ہیں۔ کچھ مشاہدات دھندلا جاتے ہیں، کچھ تجربات ماضی کا حصہ بن کر پھیکے ہو جاتے ہیں۔ مگر ناول نگار جب ناول لکھتا ہے تو وہ واقعات کو ایک عمدہ ترتیب سے سامنے لاتا ہے۔ منتخب تاثرات کو عبارت کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ مشاہدات کی مٹتی ہوئی تصویروں کو نئی زندگی دیتا ہے اور پھر سے ماضی کی پژمردہ یادوں میں نئی روح پھونک کر انھیں زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔ زندگی میں جو بے ترتیبی اور بدنظمی و انتشار پایا جاتا ہے وہ ناول نگار کی فنی، فکری اور تحقیقی مہارت سے فن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے جو ایک عمدہ فن پارہ بن جاتا ہے۔ ناول نگار کا ذاتی تاثر جس قدر مضبوط ہوگا اس کی تحریر میں زورِ بیان بھی اتنا ہی عمدہ نظر آئے گا۔ ہر ناول نگار اپنے ذاتی تاثر کو منفرد انداز میں برتنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا فن گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کہاں تک کام یاب ہوا ہے۔

انسان کے ذہن میں تجربات، مشاہدات اور احساسات سے متعلق بے شمار واقعات اور تاثرات جمع ہوتے ہیں اور مزید تاثرات قبول کرنے کی گنجائش و صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ انسان کا ذہن ہر لمحہ کوئی نہ کوئی واقعہ اپنے ذہن کے نہاں خانے میں پوشیدہ و محفوظ کرتا رہتا ہے بلکہ یہ فطری عمل خود بہ خود جاری و ساری رہتا ہے۔ اگر انھیں آپس میں ملا دیا جائے تو خیالات کی ایک کھچڑی سی بن جائے گی جو کسی کی بھی سمجھ سے بالا ہوگی جس کی کوئی ایک تصویر نہیں بن پائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھا تخلیق کار ان تجربات و مشاہدات اور جذبات کی البم سے وہی تصویر نکال کر ناول کے فریم میں سجاتا ہے جو اس کی ذاتی دل چسپی اور ذاتی تاثر کے لیے اہم اور ضروری ہوتی ہیں۔ مگر وہ ان تصویروں کو ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے پیش کرتا ہے جو دیکھنے والوں کی آنکھوں کو منظر بہاتا بھی ہے اور پڑھنے والوں کے اذہان پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور محسوس کرنے والوں

کے دلوں پر نقش ہو کر رہ جاتا ہے۔اس کا سبب میرے علم کے مطابق یہ ہے کہ ناول نگار نے اپنی زندگی کا سطحی اور سرسری مشاہدہ نہیں کیا ہوتا بلکہ اس نے زندگی کو بہت قریب اور غور سے دیکھا ہوتا ہے۔اس نے واقعی زندگی بسر کی ہوتی ہے زندگی کے حقائق و کومن وعن پیش کرنے سے زندگی کی سچی تصویر سامنے آ جاتی ہے جو عام تصویر سے زیادہ خوب صورت، دل کش، حسین و جمیل اور حسن و جمال کا پیکر نظر آتی ہے۔یہی ناول کا اصل حسن ہے۔کسی بھی ناول نگار کا زاویۂ نگاہ محدود نہیں ہونا چاہیے۔ناول میں تنوع اور جامعیت لازمی عناصر ہیں۔ان کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ناول نگار کو اختیار ہے کہ وہ ناول نگاری کے لیے تکنیک کوئی سی بھی استعمال کرے مگر واقعات کی ترتیب، پس منظر، کردار نگاری، ماحول اور اُسلوبِ بیان پر بے حد توجہ دی گئی ہو۔اس کے ساتھ ناول نگار چاہے تو ناول میں دوسری اصنافِ ادب کی خصوصیات سمو سکتا ہے اور کسی مصور کی طرح مختلف رنگوں سے اپنی کہانی کو سجا سکتا ہے اور اس میں حقائق کے رنگ بھر سکتا ہے۔لیکن وہ اتنا خیال ضرور رکھے کہ کون سا رنگ آنکھوں کو بھلا لگے گا اور کون سا رنگ تصویر کو بگاڑ دے گا۔یعنی ناول میں کہانی کے لیے پس منظر کی مناسبت سے گرد و پیش اور سیاق و سباق کے حوالے سے ماحول پیش کرنا بھی ایک فن کاری ہے اور اسی میں فن کار کی مہارت اور محنت سامنے آتی ہے۔اس سے ناول کو سنوارا جا سکتا ہے اور اسی پہلو کی کم زوری سے ناول کی صورت کو بگاڑا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اخلاقیات پر مبنی ناول میں اگر پند و نصائح کی بھرمار ہو جائے تو وہ کسی خطیب کا وعظ لگنے لگتا ہے یا کوئی اخلاقیات کا درس دینے والی کتاب۔ناول نگار کو چاہیے کہ اخلاقی ناول لکھتے وقت خیال رکھے کہ وہ اس میں اپنا کوئی بھی نظریہ پیش کرے۔زندگی کے غم، دکھ درد، رنج و الم، پریشانی اور مصائب و تکالیف کا چہرہ دکھائے یا پھر زندگی کا وہ پہلو اُجاگر کرے جس میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔شادمانی، آسودگی، چین و سکون، آرام و راحت، آسائش و زینت اور اطمینان و خوش حالی۔یہ ناول نگار پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کے کون سے پہلوؤں کو زیادہ اُجاگر کرتا ہے اور ان کے سہارے اپنے نقطۂ نگاہ کو کس طرح واضح کرتا ہے۔دونوں صورتوں میں ناول نگار کو زندگی کے ہر پہلو سے بات کرنی ہوگی کیوں کہ ہر شخص زندگی گزار رہا ہے اور اسے تجربات بھی ہو رہے ہیں۔وہ جانتا ہے کہ نہ تو زندگی خوشیوں بھرا خزانہ ہے اور نہ ہی زندگی رنج و آلام کا ٹھکانہ۔ہر انسان کی

زندگی دونوں طرح کی کیفیات سے لبریز ہے۔لہٰذا اگر کوئی ناول نگار کہانی کے کسی بھی کردار کو ایک طرح کی زندگی پیش کرتا ہے تو یہ فطرت اور حقائق کے خلاف ہوگا اور اس سے قاری کا ذہن بھی پراگندہ ہوگا۔وہ قرأت روک کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ ناول نگار نے جانب داری سے کام لے کر زندگی کا ایک ہی رخ پیش کیا ہے جو نامناسب ہے۔لہٰذا ناول نگار زندگی کے کسی رخ کو زیادہ اور کسی رخ کو کم کر کے تو پیش کر سکتا ہے مگر کسی رخ کو انسانی آنکھ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔زندگی کا رومانی منظر نامہ بھی اس کے سامنے ہوتا ہے اور زندگی کا فلسفہ بھی۔اب ناول نگار کی مرضی و منشا ہے کہ وہ زندگی کے رومانی نظریہ کو پیش کرتا ہے یا پھر زندگی کے فلسفیانہ اطوار کی بات کرتا ہے۔وہ زندگی کے کن پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے اور کن پہلوؤں کے کرداروں کو نمایاں کرتا ہے۔وہ انسان کو بے بس بھی دکھا سکتا ہے اور خود مختار بھی۔وہ انسان کو مجبور اور لاچار کر کے بھی پیش کر سکتا ہے اور بااختیار و بااقتدار بھی۔مگر جتنا انسان مجبور و لاچار ہے اتنا ہی پیش کیا جا سکتا ہے زیادہ زورِ بیان کی خاطر یا زیبِ داستاں کی خاطر رعب ڈالنا حقائق سے انحراف نظر آتا ہے۔جتنا انسان بااختیار اور بااقتدار ہے اتنا ہی پیش کیا جانا چاہیے زیادہ مبالغہ آرائی کے زمرے میں آتا ہے جو انسان کے کردار کو انسان نہیں رہنے دیتا۔اسے فرشتہ بنا دیتا ہے یا پھر غیر مرئی مخلوق کی صورت عطا کرتا ہے۔اخلاقی نقطۂ نگاہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر ناول میں ان واقعات میں شدت مناسب نہیں۔شدت سے ناول کی تخلیقیت بھی متاثر ہوتی ہے اور تخلیق کار کا مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے۔کیوں کہ ناول درحقیقت نہ تو اخلاقیات کا مبلغ و مدرس ہے اور نہ ہی کسی کی تعریف میں قصیدہ گو یا کسی کی تنقید میں ہجو گوئی کا وسیلہ۔بہترین ناول وہی ہوتا ہے جس میں زندگی کے وسیع تجربات، فلسفہ اور نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔ناول میں عوام کے مسائل و وسائل کی ترجمانی ہونی چاہیے۔افراد کے اقدار و عقائد کا اظہار ہو مگر یہ سب ناول کے فن و ہنر کے تحت ہوں۔انھیں ناول پر حاوی نہیں ہونا چاہیے۔ورنہ ناول کی جمالیات ختم ہو جاتی ہیں اور بیان بالکل سپاٹ محسوس ہونے لگتا ہے۔اخلاقی ناول میں ناول نگار اتنا ضرور کر سکتا ہے کہ ہر برے شخص کے لیے سزا، اچھے انسان کے لیے جزا اور مجرم کے لیے قید و مشقت اور قاتل کے لیے جہنم اور نیک و متقی کے لیے جنت کا ٹھکانہ تفویض کیا جائے۔اس کے برعکس بھی کہانی بُنی جا سکتی ہے مگر اس میں کوئی خلافِ فطرت بات نہیں ہونی چاہیے۔مثال

کے طور پر کوئی ناول نگار ناول میں انفرادیت پیدا کرنے کے لیے نیک کردار کو سزا، بد کو جزا اور رحمانیت کے پرستاروں کو شیطانیت سے واسطہ تو دکھا سکتا ہے مگر ان کا انجام و اختتام فطرت کے مطابق ہی ہونا چاہیے ورنہ زندگی کے حقائق سے بات ہٹ جائے تو مضا نقہ خیز نظر آتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نیک سے جب بد کا واسطہ پڑ جائے تو نیک کی صحبت اسے بھی نیک بنا ڈالے۔ یہ پہلو وسیع تر نظریۂ حیات کے زمرے میں آتا ہے اور ایسا زندگی کے عام واقعات میں ہوتا رہتا ہے۔

پاکستان ایک مسلم ملک ہے جس کے رہنے والے مسلمان ہیں اور ایک خدا کی پوجا کرتے ہیں۔ اسلام پر کاربند ہیں اور اسلامی شعار کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ہر ناگوار اور منفی بات کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں مگر کبھی بھی اپنے رب کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے۔ اگر ان کے مشاہدات میں یہ بات آتی ہے کہ ایک انسان نے تمام عمر محنت سے رزقِ حلال کمایا۔ رزقِ حلال کھایا اور سادہ سی زندگی بسر کی، کسی کو ستایا نہ کسی کا دل دکھایا مگر اسے اس کی نیک خصلتوں، اچھی عادات واطوار، اچھے اخلاق و کردار اور نرم چال و گفتار کا صلہ ویسا نہیں ملا جیسا اس کا حق بنتا تھا تو وہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتا ہے کہ یہ قدرت نے اسے آزمایا ہے، اسے آزمائش میں ڈالا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں صلہ رکھا گیا ہے۔

اگر کوئی معاشرے کا فرد ایک برے شخص کی زندگی پر نظر ڈالتا ہے کہ یہ شخص تمام عمر گناہ و زنا کرتا رہا، حرام کھاتا رہا، رشوت لیتا رہا، اسلامی شعار سے بھی روگردانی میں مصروف رہا مگر پھر بھی زندگی بھر پھلتا پھولتا رہا۔ آرام و سکون سے زندگی بسر کرتا رہا اور اسے کسی قسم کی پریشانی یا مصیبت لاحق نہیں ہوئی۔ سوچنے والا فرد اسے تضاد نہیں کہتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ اسے دنیا میں ڈھیل دی جا رہی ہے۔ اس کا حساب کتاب عقبیٰ میں سخت ہوگا۔

اگر کسی شخص کی نظر خیر و شر کی جنگ پر جاتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ خیر و شر کی جنگ میں خیر کو شکست ہوئی اور شر کی بالادستی رہی۔ شر، خیر پر غالب آتا رہا ہے۔ ظالم پنپتا ہے اور مظلوم آفت زدہ ہو کر مر جاتا ہے۔ جیسے کربلا کا واقعہ یادگار بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں سوچنے والا کہتا ہے کہ یہ تو قسمت کا لکھا تھا، مقدر میں یہی ہونا تھا، کاتبِ تقدیر نے اسی طرح قسمت لکھی تھی، ہم دوسرے پہلو پر نہیں سوچتے۔ بہرحال اخلاقی ناول کی کہانی کو بغیر پند و نصیحت کے بُنا بھی جا سکتا ہے۔ جس کی کہانی کا اختتام ایسے اخلاقی انجام پر مبنی ہو کہ انسان کی اصلاح کا سبب بن جائے۔ اس کے دل پر ایسی ٹھیس لگے کہ وہ خود بہ خود اصلاح کی طرف آ جائے۔ اگر کوئی ناول نگار بغیر پند و نصیحت کے اخلاقی ناول لکھتا ہے تو وہ ان اخلاقی ناولوں سے بہتر ہے جو پند و نصیحت کی کتاب معلوم ہوتے ہیں۔ اخلاقی ناولوں کی یہ تکنیک سب سے عمدہ اور کامیاب قرار دی جا سکتی ہے۔ نئے اُردو ناول میں اسی تکنیک سے بھرپور استفادہ کیا جا رہا ہے۔ ناول نگار کبھی اپنے ناول پر زندگی کے منفی پہلوؤں پر تنقید کرتا ہے اور کبھی اس کے مثبت پہلوؤں کی تفسیر و تشریح کرتا نظر آتا ہے۔ بہرحال یہ دونوں پہلو زندگی کی عکاسی اور ترجمانی کرتے ہیں۔ اس سے ناول کا فن زندہ رہتا ہے اور یہی عنصر ناول کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کو ہم ناول کا مرکز و محور قرار دیتے ہیں۔ ناول درحقیقت زندگی کا عملی اظہار ہے جس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف زاویوں کو نشیب و فراز کے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے کیوں کہ ناول نگار جو کچھ ناول میں لکھ رہا ہے اس کا تعلق اس کے تجربات سے ہے یا پھر اس کے مشاہدات اس کی راہ نمائی کر رہے ہوتے ہیں۔ اس میں ناول نگار کے جذبات اور احساسات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ ناول نگار یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اس کا سو فی صد حقیقت سے تعلق ہے۔ اگر یہ درست ہے تو ناول لکھنے کا مقصد ہاتھ آتا نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ ناول نگار کے خلوص پر مبنی ہوتا ہے کہ وہ ناول کس مقصد اور نقطۂ نظر کے تحت لکھ رہا ہے یا فقط دولت کمانا اس کا مقصد ہے۔ دولت کمانے کے لیے جو تحریر لکھی جاتی ہے وہ ڈیمانڈ کے مطابق لکھی جاتی ہے جس کا نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور نہ کوئی نقطۂ نگاہ۔ ایسی تحریریں ڈائجسٹ کے معیار کی ہوتی ہیں اور انھیں میں شائع ہوتی ہیں جن کو لوگ وقت گزاری اور سامانِ تفریح کے طور پر مطالعہ کرتے ہیں اور مطالعے کے بعد ردی کی ٹوکری کی نظر کر دیتے ہیں مگر جو ناول اخلاقی، اصلاحی اور مقصدی نقطۂ نگاہ سے لکھے جاتے ہیں وہ ادبی کہلاتے ہیں۔ ان سے معاشرے میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، سماج میں بدلاؤ آتا ہے، انسانی ذہن میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور انسان کی زندگی کروٹیں لیتی ہے۔ کیوں کہ یہ تحریر ناول نگار کے ذاتی تاثرات اور ذاتی ادراک کے نتیجے میں سرزد ہوتی ہے۔ اس میں ڈیمانڈ یا دولت کمانے کا عنصر و لالچ شامل نہیں ہوتا۔ ایسے ناول سے ادب اور زندگی کا امتزاج ہمارے سامنے آتا ہے اور ادب اور زندگی سے ہمارے رابطے اُستوار

ہوتے ہیں۔ حقیقت نگار ناول نگاروں کی تخلیقات سے نہ صرف قارئین لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ معلومات میں اضافے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ایک اچھا ناول نگار اپنے زورِ بیان، حقیقت نگاری اور فن کے ذریعے کند ذہنوں کو تیز، بے حس افراد کو سوچ بچار کی صلاحیت اور بے پروا لوگوں کو احساسِ ذمے داری پر تیار کرتے ہیں۔ ان میں کچھ کر گزرنے کی جوت جگاتے ہیں۔ یہ مثبت افکار و نظریات کے باعث تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ ناول نگار ایک طرح کا معاشرے کے لیے حاذق طبیب کا کام بھی کرتا ہے۔ وہ معاشرے کے جسم پر لگے زخموں پر مرہم بھی رکھتا ہے اور ناسوروں کی جراحت کا کام بھی کرتا ہے تا کہ معاشرتی جسم و بدن کو بیماریوں، برائیوں اور اخلاقی گراوٹ کے کینسر سے بچایا جا سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو ناول مغربی ناول کی پیداوار ہے مگر مغربی ناول میں ہر سال جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان سے اکثر کو رداس لیے کر دیا جاتا ہے کہ وہ معاشرے کے لیے مفید نہیں ہوتیں مگر آج کے اُردو ناول میں آغاز سے اب تک ایک چیز کی حیثیت بنیادی رہی ہے جو اس کا مرکز و محور ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارا اُردو ناول کام یابی و کامرانی کے سفر پر گامزن ہے اور فن کی معراج حاصل کر رہا ہے۔ وہ بنیادی عناصر حیات و کائنات کا نظریہ ہے جسے ہر اُردو ناول نگار نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔ کہیں رموزِ زندگی پر بات کی ہے اور کہیں اسرارِ کائنات پر گفتگو، ہر ناول نگار مصائب و آفاقت و بلیات سے گزرتا ہے مگر مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ مشکلات، کٹھن اور ناساعد حالات کے باوجود گھٹن، بے زاری، تنہائی، تشدد، جنسی بے راہ روی، قتل و غارت گری، لوٹ کھسوٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کے پاس ہمتِ مردانہ ہوتی ہے، بلند حوصلے سے جیتا ہے اور مردانہ وار مشکلات اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتا ہے جو عام زندگی میں جن درپیش مسائل و وسائل سے اس کا واسطہ پڑتا ہے وہ انھی کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ناول نگار کا دل نرم، محبت سے لبریز اور نرم دل ہونے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں بھی انسان دوستی، اخلاق و مروت، ہم دردی، خدا ترسی، عشق و محبت، انسانیت کا احترام، آس و امید، توقع، لطیف جذبات، نازک احساسات در آتے ہیں جن کی وجہ سے ہمارا اُردو ناول معاشرے کی جیتی جاگتی اور زندگی کی سچی تصویر پیش کرتا ہے اور یہ کسی ناول کی ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتی ہے۔ جیسے کسی زبان کو زندہ رکھنے

کے لیے اس میں نت نئے الفاظ داخل کرنا اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح ناول کو بھی زندہ رکھنے کے لیے اسے انسانیت کے فلسفے سے وابستہ کرنا، انسانیت کے ادب و احترام کے تصورات سے آشنا کرنا، اخلاقی روایات کی ڈگر پر چلانا اور حیات و کائنات سے فائدہ اُٹھانا بے حد ضروری ہے۔ اگر ناول میں ان تمام چیزوں کا خیال رکھا جائے تو ناول اپنی پوری طاقت کے ساتھ پرواز کرتا نظر آئے گا۔

نئے اُردو ناول کی کام یابی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس میں حیات و کائنات کے فلسفوں کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم پر بھی بات کی جا رہی ہے اور نئی نئی ٹیکنالوجیوں کو بھی برتا جا رہا ہے۔ نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے نئے مضامینِ فنونِ لطیفہ کو بھی داخل کیا گیا ہے اور شعر و ادب کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ جس طرح سائنسی علوم ہمیں جدت سے آشنا کرتے ہیں اسی طرح فطین ذہن رکھنے والے شاعر کی شاعری ہمیں امکانات کی آگاہی دیتی ہے۔ ناممکنات کی بات کرتی ہے اور نئے نئے خیالات کی خبر دیتی ہے۔ آنے والے زمانوں سے ملواتی ہے اور معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، بدلاؤ اور تغیرات سے پہلے سے مطلع کرتی ہے مگر شاعری، سائنس اور اس کی جدید ٹیکنالوجیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری اور فنونِ لطیفہ اگر تھیوری ہے تو نئی ٹیکنالوجیاں پریکٹیکل کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ سائنسی علوم کی ضرورت ہمیں زیادہ ہے۔ اس لیے نئے ناول کو سائنسی علوم سے زیادہ قریب ہونا چاہیے۔ کچھ ناول نگار جدت کا بیڑہ اُٹھائے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے نیا اُردو ناول روز بہ روز ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ اب یہ صنف رو بہ زوال نہیں۔ اب جدید ناول بھی لکھے جا رہے ہیں اور ناول کی تنقید بھی سامنے آ رہی ہے۔ اس فنِ ناول نگاری نے فن کی معراج حاصل کر لی ہے۔ اب اس کی ترقی کے امکانات مزید روشن ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ اب اُردو ناول نگار سائنسی ایجادات کے ساتھ ساتھ دیگر فنون کا جائزہ بھی ناول میں پیش کر رہا ہے۔ سائنس ہمیں فطرت کے جن حقائق سے آگاہ کر رہی ہے، ناول نگار ان حقائق کو انسانی ذہن سے تخیل کے پیکر میں لا کر صفحۂ قرطاس پر پینٹ کر رہا ہے۔ اس تصویر میں فطرتِ انسانی کے حقائق بھی ہیں، رموزِ زندگی کے نکات بھی اور اسرارِ کائنات بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا اُردو ناول انسان، انسان کی زندگی اور اس کے معاشرتی

تعلقات سے بات کرتا ہے۔ اُردو ناول انسان، زندگی، کائنات مذہب، اخلاق، سیاسی اور سماجی زندگی پر محیط ہے۔ یہ انسان کو ہونے والے تلخ و شیریں تجربات، شدید جذبات، تصورات و تخیلات، اعمال و افعال، خیالات و افکار، خوابِ دل نشیں اور تمناؤں کا آئینہ ہے۔ اس لیے قارئین کی پسندیدہ صنف ہے اور قارئین دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں اسے زیادہ پسند بھی کر رہے ہیں اور اس کا مطالعہ بھی بڑھا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکیس ویں صدی کے آغاز ہی میں 140 سے زیادہ اُردو ناول زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔

میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرتا چلوں۔ کہا جا رہا ہے کہ انٹرنیٹ، الیکٹرونک میڈیا اور موبائل فون نے کتاب کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ کتاب کی اہمیت مرتے دم تک کم نہیں ہو سکتی۔ یہ تا قیامت جاری رہے گی۔ ناول کا موضوع انسان اور اس کی زندگی ہے لہٰذا جب تک انسان اور اس کی زندگی قائم رہے گی تب تک ناول کی قرأت باقی رہے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کا انسان مصروف زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا ہے اس کے پاس اتنی مہلت اور اتنی فرصت نہیں ہے کہ قدیم زمانے والوں کی طرح داستانیں پڑھے یا کہانیاں سنے۔ ٹیلی ویژن اور فلموں نے بھی ناول کی قرأت پر اثر ڈالا ہے مگر ٹیلی ویژن کے ڈرامے، فیچر اور مختلف پروگرام اور فلمیں جذباتی اور سنسنی خیزی کے پروگرام پیش کر کے عارضی نوعیت کا ہیجان اور انتشار تو پیدا کر سکتے ہیں مگر سنجیدہ، مذہبی، اخلاقی، ثقافتی، روحانی اور سیاسی مسائل کا تجزیہ بیان نہیں کر سکتیں۔ الیکٹرانک میڈیا جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔ احساسات کی نمائندگی سے عاری ہے۔ جذبات کو من و عن پیش کرنے سے عاجز ہے۔ انسان کے روحانی مسائل کا تجزیہ الیکٹرانک میڈیا کے بس کی بات نہیں۔ وقتی طور پر الیکٹرانک میڈیا عوام میں مقبولیت تو حاصل کر گیا ہے مگر اپنی تمام تر تیز رفتاری اور دست رس کے باوجود زندگی اور اس کی جزیات اور ان کے حقائق کو افشا کرنے سے معذور ہے کیوں کہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے انسانی سوچ اور اس کی فکر کو مکمل طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ٹیلی ویژن پروگراموں کا تعلق بصارت سے ہے جب کہ ناول کا تعلق زبان و بیان اور لسانیت سے۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو تفریحِ طبع اور وقت گزاری کے لیے تو دیکھا جا سکتا ہے مگر زبان و بیان اور فکر کے ارتقا کے لیے یہ ناکام یاب ہوتے ہیں۔ ناول اس لیے بھی

کام یاب و کامران ٹھہرتے ہیں کہ ان میں سائنسی ایجادات، علوم و فنون اور ٹیکنالوجیوں کے باوجود وہ معاشرتی اقدار، تہذیب و ثقافت، سیاسی قلابازیوں، عشق و محبت کے فطری رنگوں سے مزین نظر آتا ہے اور ناول میں حقیقت پسندی کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات کو ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے یوں سمجھ لینا چاہیے کہ انسان کے داخلی و خارجی تاثرات کے مجموعے کا نام ناول ہے۔ ناول میں حقیقت نگاری بھی ناول کی جان قرار پاتی ہے۔ حقیقت نگاری ہی اسے تخلیقی اور جمالیاتی سطح پر ناول کا درجہ دیتی ہے۔

◆◆◆

اُردو ناول کی موجودہ صورتِ حال

آج نیا اُردو ناول جس سطح پر ہے وہ مقام اطمینان بخش تو ہے مگر اُردو ناول کو اس سے بہت آگے جانا ہے، اسے کئی معرکے اور سر کرنے ہیں اور مزید کام یابیوں اور کامرانیوں سے ہم کنار ہونا ہے۔ ابھی اُردو ناول کی راہ میں کچھ رکاوٹیں حائل ہیں جنہیں عبور کر کے مزید بلندیوں کو چھونا ہے۔ میں اس بات کی تصدیق ضرور کروں گا کہ مغربی ناول سے ابھی اُردو ناول کچھ فاصلے پر ضرور ہے مگر اس بات کی تردید کرنا بھی ضروری ہے کہ ''اُردو ناول آج بھی بچپنے کے دور میں ہے۔'' ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اُردو ناول اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہے اور اس نے اپنے ارتقائی سفر کی کئی منازل بڑی کام یابی سے طے کر لی ہیں۔ اگر ہم اُردو ناول کی تاریخ اور اس کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لیں تو یہ بات بڑی آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو ناول نے بہت کم عرصے میں زیادہ فاصلہ طے کر لیا ہے کیوں کہ ابھی اُردو ناول کو 150 برس بھی نہیں ہوئے مگر وہ مغربی ناول کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے اور اس کی صف میں نظر آنے لگا ہے۔ ناول کی اس فہرست میں اُردو ناول کا نمبر کیا ہے یہ بات ابھی واضح طور پر سامنے نہیں آ سکی ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اُردو ناول کی تخلیق، تحقیق اور تنقید کے ساتھ ساتھ اس کے تجزیاتی مطالعے سے مایوسی کی فضا ختم ہو جاتی ہے۔ ایک خوش گوار حیرت کا سامنا ہوتا ہے کہ اتنے کم عرصے میں اُردو ناول نے عالمی سطح پر اپنی پہچان بنا لی ہے اور اپنا نام عالمی ادب کے تناظر میں شامل کرا لیا ہے۔

ناول کی تخلیق اور اس کی دریافت چند دنوں کا کام نہیں ہے۔ اس میں زمانے لگ جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اُردو ناول کی بہتری کے جواز میں مزید وقت درکار ہے۔ کسی بھی صنفِ ادب کا ارتقا چند مہینوں یا چند برسوں پر محیط نہیں ہے بلکہ اس میں انہیں صدیاں صرف کرنی پڑی ہیں۔ لہٰذا ہمیں

ناول کی تنقید اور اس کی دریافت میں صبر و انتظار سے کام لینا ہوگا تا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے شیریں ثمر ہمارے ہاتھ لگتے رہیں۔ مغربی ناول کی طرف نظر اُٹھائیے تو یہ معاملہ وہاں بھی نظر آتا ہے۔ مغربی ناول کو آج پوری دنیا میں جو شہرتِ دوام اور قبولیتِ عام حاصل ہے وہ چند برسوں پر محیط نہیں بلکہ اس میں بھی اسے صدیاں لگی ہیں۔ اگر ہم اُردو ناول کے معاملے میں عجلت پسندی کا مظاہرہ کریں گے تو ہم ناول کے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں گے اور نہ ہمیں ناول کی پرتیں کھولنے کا موقع ملے گا اور نہ اسے کھنگالنے کے مواقع میسر آئیں گے۔ اس عجلت پسندی سے ناول کی کئی جہات کو خاک میں ملانا پڑے گا۔ ناول میں جو عناصرِ ترکیبی (پلاٹ، پس منظر، کہانی نقطۂ نگاہ اور اُسلوبِ بیان) ہیں، ان میں سے ہر ایک کا تجزیہ آسان نہیں۔ ہر ایک عنصر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو فیصلے کیے گئے ہیں اور نئے اُردو ناول پر جو تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئے اُردو ناول کی موجودہ صورتِ حال اطمینان بخش ہے اور اس کا مستقبل روشن ہے۔ آج اُردو ناول پاکستان و ہندوستان سمیت اُردو کی نئی بستیوں میں جو لکھا جا رہا ہے اس کے موضوعات اور حسنِ بیان اتنے دل کش ہیں کہ وہ حیرت انگیز طور پر قارئین کی ضرورت بن گیا ہے اور اسے عالمی شہرت حاصل ہو گئی ہے۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اُردو ناول کی موجودہ نکھری ہوئی صورت جو ہمارے سامنے ہے وہ بیس ویں صدی کے ناول نگاروں کی مرہونِ منّت ہے کیوں کہ قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی، شوکت صدیقی، رضیہ فصیح احمد، ممتاز مفتی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، حیات اللہ انصاری، انتظار حسین، جیلانی بانو، جوگندر پال، بانو قدسیہ، انور سجاد، انیس ناگی، محمد خالد اختر، جمیلہ ہاشمی، مستنصر حسین تارڑ، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، راجندر سنگھ بیدی، ابوالفضل صدیقی، پریم چند، مرزا ہادی رسوا، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، کرشن چندر، الیاس گدی، رشیدہ رضویہ، سجاد ظہیر، نثار عزیز بٹ، حجاب امتیاز علی، علیم مسرور، کریم فضلی، غلام عباس اور فہیم اعظمی جیسے ناول نگار شہرۂ آفاق ناول اُردو ادب کے دامن میں نہ ڈالتے تو آج اُردو ناول کی یہ صورتِ حال نہ ہوتی، ہمارے اسلاف ناول نگاروں نے صنف ناول کو خونِ جگر سے سینچا ہے تبھی یہ پودا آج تناور درخت کی شکل اختیار کر سکا ہے۔ آج کا ناول جو اس قدر مقبولیت اور قارئین کی توجہ حاصل کر گیا ہے اس

کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی بڑی اور قد آور ادبی شخصیات اس کے سنوارنے میں مبتلا رہی ہیں۔ دنیا کے ذہین ترین دماغ اس کو نکھارنے میں مصروف رہے ہیں۔ دنیا کے حساس ترین دل رکھنے والے اہلِ قلم اپنے شانۂ فکر سے ناول کی زلفیں سلجھانے اور سجانے میں سرگرداں رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ناول کا چہرہ روشن ہے اور اپنی تمام تر، تر و تازگی کے ساتھ سانس لے رہا ہے۔
دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ناول میں انسان، انسانی زندگی اور عہد و معاشرے کے بے شمار موضوعات سمو دیے جاتے ہیں جس کا تعلق انسان اور اس کی سوچ سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور انسان اور اس کی زندگی سے نسبت رکھتا ہے۔ اس میں حیات و ممات اور کائنات کے اسرار و رموز پر بھی بحث کی جا رہی ہے اور کرداروں کے تضادات اور نیک و بد اعمال و افعال کی بحث بھی ناول کا موضوع رہی ہے۔ انسانی حواسِ خمسہ، اس کی تقدیر، خیر و شر، تاثرات، تصورات و خیالات، تخیلات، خوشی و غمی، ہجر و وصال، ملن و جدائی، مایوسی و اُمید، رجائیت و قنوطیت، آخرت کی زندگی، دنیا کے بے ثباتی، وقت اور زمانہ، موسم و آب و ہوا۔ غرض کے انسان کے داخلی و خارجی تمام عناصر کو ناول میں بیان کیا جاتا ہے۔

کسی بھی ناول کو پڑھنے کے بعد اگر اختتامیہ پر بات ختم ہو جاتی تو کبھی بھی ناول کی دریافت اور ارتقا پذیری سامنے نہ آتی اور ہوسکتا ہے کہ ناول کا وجود ہی مٹ جاتا مگر ناول کے زندہ رہنے میں سب سے بڑا ہاتھ ان سوالات کا ہے جو ناول کے اختتامیہ کے بعد جنم لیتے ہیں۔ ہر ناول کی ایک مقررہ وقت میں قرأت مکمل ہو جاتی ہے مگر وہ جو سوالات چھوڑ جاتا ہے اس سے اس کی تحقیق و تنقید اور دریافت کا عمل سامنے آتا ہے بلکہ وہی سوالات دوسرے ناول کے لیے راہیں ہموار کرتے ہیں اور انہی ناولوں کے اُٹھائے گئے سوالات کے جوابات میں متعدد ناول جنم لیتے ہیں۔ میرا یہ نقطہ نیا تو ضرور محسوس ہوگا مگر اس کے وجود سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ جب کوئی قاری کسی ناول کو ختم کر لیتا ہے تو اس کے ذہن میں متعدد سوالات اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کے بارے میں وہ پہروں سوچتا رہتا ہے۔ یہ سوالات مندرجہ ذیل قسم کے ہوتے ہیں:

1۔ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟
2۔ کوئی انسان درندہ کیسے بن سکتا ہے؟

3۔ مقدس رشتوں کو پامال کرنے والے لوگ کون سے خمیر سے بنے ہوتے ہیں؟
4۔ کیا کوئی خدا بھی ہے؟
5۔ جبر و قدر کے مسئلہ کی حقیقت کیا ہے؟
6۔ انسان مجبور ہے یا با اختیار؟
7۔ کیا واقعی تقدیر کا جواز ہے؟
8۔ کیا دنیا واقعی بے ثبات ہے اور اسے ایک نہ ایک دن مٹ جانا ہے؟
9۔ کیا محشر بپا ہوگا؟
10۔ کیا ہر چیز کا حساب کتاب دینا ہوگا؟
11۔ قبر کیا ہے؟
12۔ کیا دنیا کی زندگی کے بعد بھی دوسری زندگی ہے؟
13۔ وقت کس چیز کا نام ہے؟
14۔ زمانہ کسے کہتے ہیں؟
15۔ خیر و شر کی حقیقت کیا ہے؟
16۔ خارجی حالات میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟
17۔ کیا داخلی جذبات کا پیکر تراشا جاسکتا ہے؟
18۔ کردار کی کیا اہمیت ہے؟
19۔ کیا کسی ناول کا پلاٹ یوں بھی ہوسکتا ہے؟
20۔ کیا پس منظر میں اندر کے انسان کو دکھایا جاسکتا ہے؟
21۔ روح کیا ہے؟
22۔ کیا حسنِ بیان اس قدر طلسماتی بھی ہوسکتا ہے؟
23۔ کوئی تحریر انسان کی زندگی کو کیسے بدل سکتی ہے؟
24۔ کیا یہ کہانی سچ بھی ہوسکتی ہے؟
25۔ یہ حقیقت تھی یہ کوئی خواب؟

اس قسم کے سوالات ہر قاری کے ذہن میں اُٹھتے ہیں جن کا جواب پانے کے لیے ایک تخلیق

کاردوسری چیز تخلیق کرتا ہے۔ایک ناول نگاردوسراناول لکھتا ہے۔

مذکورہ بالا کثیر سوالات مغربی ناول کو پڑھنے کے بعداُسی معاشرے کے افراد کے اذہان میں اُبھرتے ہیں۔مگر اُردو ناول کو پڑھنے کے بعد اُٹھنے والے سوالات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔یہ سوالات خدااوراس کے تصور، جزاوسزا، خیروشر، قسمت، تقدیر، مقدر، حشر، قیامت، قبراور برزخ کے بارے میں نہیں ہوتے کیوں کہ اُردو ناول جس پس منظر، معاشرے اور ماحول میں جن قارئین کے لیے لکھا جارہا ہے ان کا تعلق جس مذہب اور عقائد سے ہے وہ ان سوالات کے جوابات جانتے ہیں۔اُردو ناول کے قارئین کے اذہان میں اس قسم کے سوالات جنم لے سکتے ہیں:

1۔ کیاواقعی شیطان اس قدر طاقت کا مالک ہے؟
2۔ کیاروحانیت سے یہ بھی ممکن ہے؟
3۔ تصوف میں یوں بھی کیا جاسکتا ہے؟
4۔ ایک انسان شیطان کیسے بن سکتا ہے؟
5۔ کیافلاں کردار کو برے کام کی سزا ملے گی؟
6۔ کیانیک انسان کواس کی جزا ملے گی؟
7۔ کیا کوئی انسان، انسانیت سے یوں بھی گر سکتا ہے؟
8۔ کیا کوئی انسان جنسی ہوس میں یوں بھی اندھا ہوسکتا ہے؟
9۔ کیارشتے یوں بھی توڑے جاسکتے ہیں؟
10۔ خود کو بھولنا کیسے ممکن ہے؟
11۔ ضمیر کا اثر ہوتا ہے یا یہ یونہی مفروضہ ہے؟
12۔ کیا صبر کا پھل واقعی میٹھا ہوتا ہے؟
13۔ کوئی شکر گزاری میں اس حد تک بھی جاسکتا ہے؟
14۔ اس کائنات کا مالک وخالق اللہ تعالیٰ ہے؟
15۔ خدا ہی کاتبِ تقدیر ہے؟
16۔ میری قسمت میں یونہی لکھا تھا؟
17۔ دنیا دارالفنا ہے؟

محشر بپا ہوگا اور نیک و بداعمال وافعال کا حساب دینا ہوگا؟
18- جزاوسزا اٹل کرر ہے گی؟
19- اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے وہ نہ جانے کیسی ہوگی؟
20- کیاوقت ہر زخم کا مرہم ہے؟
21- کیا ہر انسان کے اندر ایک اور انسان رہتا ہے؟
22- اسے ہم حقیقت تسلیم کریں یا فسانہ؟
23- کیا کوئی انسانی ذہن اتنا فطین بھی ہوسکتا ہے؟
24-

دنیا میں متعدد عقائد و نظریات اور مسالک و مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ناول نگار بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور ناول کے قارئین بھی۔لہٰذا ہر شخص اپنے علم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوچتا ہے اوراس کے ذہن میں سوالات بھی اس کی آ گاہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ہر انسان معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر کرتا ہے۔کچھ قارئین کو ان کے سوالات کے جوابات ناول ہی میں مل جاتے ہیں اور کچھ کے سوالات تشنہ رہ جاتے ہیں۔یہ مذہب و مسلک کی بنیاد پر ایسا ہوتا۔ایک دہریے کے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ یہ کائنات خود بہ خود وجود میں آئی ہے تو اس کا بنانے والا کیوں کر ہوسکتا ہے۔

ایک مسلمان کے ذہن میں اس سوال کا جواب یوں اُبھرے گا۔''اس دنیا کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔اس کا بنانے والا موجود ہے۔اس کے بغیر اس کا نظام کیسے چل سکتا ہے۔؟''

الختصر......ناول میں دنیا بھر کے موضوعات کے تحت مواد سمویا جاسکتا ہے مگر اس کا مرکز ومحور انسان اوراس کی زندگی ہی رہے گا۔یہی ناول کی زندگی کا ثبوت ہے کہ وہ ایک زندہ موضوع انسان اور متحرک چیز اس کی زندگی کو بنیاد بنائے ہوئے ہے۔اب یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ جب تک انسان اوراس کی زندگی کا وجود رہے گا ناول کا وجود بھی برقرار رہے گا۔ناول کی تخلیق بھی اسی طرح ہوتی رہے گی اوراس کی تحقیق و تنقید اور دریافت کا عمل بھی یوں ہی جاری رہے گا۔

اُردو ناول کی موجودہ صورتِ حال بھی اس بات کی غماز ہے اور اسی نقطے کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ آج کا نیا اُردو ناول انسان اوراس کی زندگی پر محیط ہے۔وہ معاشرے کے رسوم ورواج کی بات کررہا ہے، انسان اوراس کی زندگی کی بات کررہا ہے، کیوں کہ رسوم ورواج کا تعلق انسان اور

اس کی زندگی ہی سے ہے انھی سے یہ معاشرہ بھی قائم ہے اوراس میں رسوم ورواج بھی۔ اگر ناول نگار تقدیر، قسمت، مقدر اور نصیب کی بات کر رہا ہے تو وہ انسان اوراس کی زندگی کی بات کر رہا ہے کیوں کہ نصیب اور مقدر کا تعلق براہِ راست انسان سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا اوراس کی تقدیر لکھی، وہ کاتبِ تقدیر ہے۔ لہٰذا جزا وسزا، جبر وقدر اور حشر وقیامت کے حوالے سے کوئی بات بھی ہوگی تو اس کی نسبت انسان سے ہوگی، اس کا تعلق انسانی زندگی سے ہوگا۔ یہ مرکز ومحور ہی اُردو ناول کی معراج ہے۔ ان کرداروں کے ذریعے ناول نگار کہانی کو آگے بڑھاتا ہے، پلاٹ تیار کر کے کرداروں کا انتخاب کرتا ہے اور کردار کی نسبت سے پس منظر پیش کرتا ہے، اس پس منظر اور کہانی میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت غیر محسوس انداز میں کرتا ہے جس کے لیے ایک ایسا دل نشیں اور طلسماتی اُسلوبِ بیان اپناتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں اس کی بات اُترتی چلی جاتی ہے اور وہ متاثر ہوئے بنا رہ نہیں سکتا۔ یہی ناول نگار کا کمالِ فن ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے واقعات کو ترتیب سے اس طرح پیش کیا کہ قاری نہ تو اس سے جدا ہوا، اور نہ اس کے مطالعے سے اُکتایا۔ یہ سب کچھ اسے مانوس لگا۔ ایک اسی نقطے سے قاری اور ناول کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے جو ناول کے فن کا کمال وہنر ہے۔

◆◆◆

اکیس ویں صدی میں اُردو ناول

کہاوت مشہور ہے ''کٹورے پہ کٹورا بیٹا باپ سے بھی گورا''۔ یہ حقیقت ہے کہ اُردو ناول نے اُردو داستان سے جنم لیا ہے اس لیے یہ اپنی ماں سے بھی زیادہ حسین وجمیل اور خوب صورت ہے۔ کیوں کہ داستان کو پرانے زمانے میں وقت گزاری کا سہارا سمجھا جاتا تھا اور فرصت کے اوقات کا بہترین مشغلہ داستان گوئی تھا۔ مگر اُردو ناول میں حقائق کے بیان نے اسے نہ صرف داستان گوئی سے علاحدہ کر دیا ہے بلکہ ایک علاحدہ صنف کے طور پر منفرد وممتاز مقام پر پہنچا دیا۔

آج کے اُردو ناول کا پھیلاؤ اس قدر زیادہ ہے کہ اس میں سبھی کچھ سما جاتا ہے اور ناول نگار کا فن یہی ہوتا ہے کہ وہ ناول میں تمام کردار، سماجی رویے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کرے۔ یہ ناول کا پھیلاؤ ہی اس کا فن ہے۔ اسی پھیلاؤ کا نتیجہ ہے کہ اُردو ناول علاقے سے نکل کر شہر، شہر سے نکل کر ملک اور ملک سے نکل کر بین الاقوامی سطح تک پھیل گیا ہے۔ جس طرح پوری دنیا گلوبل ویلیج بن گئی ہے تو اس گلوبل ویلیج کو دیکھنے والی آنکھ ناول نگار کی ہے۔

اکیس ویں صدی کا ناول اس سبب سے بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ اس میں مروّج علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون کا احاطہ بھی کیا جا رہا ہے۔ انٹرنیٹ، موبائل فون، سیٹلائٹ، سیاروں اوران پر بسنے والی مخلوق پر بھی ناول لکھے جا رہے ہیں۔ آج کا ناول محدود نہیں رہا بلکہ اس کی وسعت لامحدود ہوتی جا رہی ہے۔ آج کا ناول رزمیہ نگاری بھی ہے اور زندگی کی ترجمانی بھی، معاشرتی رویوں کا عکاس بھی ہے اور مختلف انسانی کرداروں کا بیان کرنے والا بھی۔ آج کا ناول نگار وسیع النظر اور زیرک ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین وفطین بھی ہے جو انسانی زندگی کے مختلف نشیب وفراز، تلخ وشیریں تجربات، عمیق مشاہدات اور شدید جذبات لکھ کر ناول میں تازگی اور جدت پیدا کر رہا ہے جس کے سبب ناول کے قارئین میں اعتبار قائم ہو رہا ہے اور ناول کی قرأت

میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔

اُردو ناول کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو ناول نے اپنے ارتقائی سفر میں بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں اور بہت زیادہ پُر کٹھن اور دشوار گزار راستوں سے گزرنے کے لیے پیچیدہ موڑ کاٹے ہیں مگر آج اس کی راہیں ہموار ہو گئی ہیں اور وہ فن کی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہے۔ کیوں کہ آج کے اُردو ناول میں نئے موضوعات اور جدید رجحانات کو برتا جا رہا ہے۔ نئی نئی سائنسی ایجادات کو موضوع بنایا جا رہا ہے۔ کیوں کہ سائنسی ایجادات نے انسان کی زندگی کو یک سر بدل کر رکھ دیا ہے۔ جس قدر تغیرات و تبدل انسان کی زندگی اور اس کے معاشرے میں سائنسی ایجادات نے پیدا کر دیے ہیں وہ نا قابلِ فراموش ہیں، لہٰذا ان حقائق سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ نہ انھیں نظر انداز کر کے گزرا جا سکتا ہے۔

اکیس ویں صدی میں جو نئے ناول کی نئی صورت سامنے آئی ہے اسی بنا پر اکیس ویں صدی کو ناول کی صدی کہا جا رہا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ابھی نئی صدی کے صرف سترہ برس گزرے ہیں۔ ان سترہ برسوں میں ایک سو چالیس 140 سے زائد اُردو ناول شایع ہو چکے ہیں اور یہ تعداد وہ ہے جو ناول منظرِ عام پر آئے اور جن کا چرچا ہوا۔ ان کے علاوہ وہ ناول بھی ہیں جو چرچا نہ ہونے کی بنا پر دب کے رہ گئے۔ مگر 140 ناولوں کی تعداد بھی قابلِ ذکر ہے کیوں کہ بیس ویں صدی میں اُردو ناول کی رفتار بہت کم تھی۔

اُردو ناول بیس ویں صدی میں لکھا گیا ہو یا اکیس ویں صدی میں۔ یہ کئی زمانوں پر پھیلا ہوتا ہے اور کئی کرداروں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس میں مختلف رویوں پر بحث ہو رہی ہوتی ہے اور کئی نشیب و فراز کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ لہٰذا کسی ایک مضمون میں ناول کے مباحث کو سمیٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اس کی بے شمار جہات ہیں جن کا احاطہ ایک مضمون میں مشکل ہے۔ آپ ایک مضمون میں کتنے ہی پہلوؤں اور کتنی ہی جہتوں پر بحث کریں، کتنے ہی موضوعات پر قلم اُٹھائیں، پھر بھی کوئی نہ کوئی پہلو اور کوئی نہ کوئی جہت تشنہ رہ جاتی ہے۔ ناول پر بحث اور اس کے بیان کے لیے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔

کسی بھی ناول، اس کی تنقید یا ناول پر لکھے گئے تنقیدی مضامین کی کتاب کا مطالعہ بھی کیا جائے تو پوری کتاب میں بھی تشنگی محسوس ہوتی ہے، کوئی نہ کوئی خامی اور کمی رہ جاتی ہے۔

کیوں کہ کوئی مضمون نگار یا نقاد ناول کے متن پر گفتگو کرے گا یا موضوع پر، وہ ناول کی تکنیک کو زیرِ بحث لائے گا یا پھر اُسلوبِ اظہار کو اجاگر کرے گا، کوئی مشاہیر ناول کے رجحان پر لکھے گا یا پھر اس کی عبارت کی ندرت کو سامنے لائے گا، اس کے باوجود ناول کی فنی اور فکری جہات رہ جائیں گی مگر اس بات کو کھلے دل سے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان تمام موضوعات پر قلم اُٹھانے اور تنقید لکھنے سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ ناول کی تنقید کے دامن میں وسعت پیدا ہوگی اور اس کے فن کو جلا ملے گی۔ ناول نگاری میں مزید نکھار اور سنوار آ جائے گا جس سے ناول کی قرأت اور اعتبارات میں اضافہ ہوگا اور اسی بنا پر، اکیس ویں صدی میں اُردو ناول اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ اس کی کم مائیگی میں کمی آئی ہے، اس کا دامن نئے اور جدید موضوعات سے مالا مال ہو گیا ہے۔ آج کے اُردو ناول نے عالمی تناظر میں قدم رکھ دیا ہے اور متعدد ناول دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر عالمی ادب کا حصہ بن گئے ہیں جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو ناول نے دامنِ اُردو ادب کو وقیع سرمائے سے مالا مال کر دیا ہے۔

اُردو ناول کی خوش قسمتی کہیے کہ دیگر زبانوں میں اُردو ناول کے تراجم ہونے سے جو واضح فرق سامنے آیا ہے وہ یہ کہ اُردو ناول کا شمار عالمی ادب میں ہونے لگا ہے۔ دیگر ممالک کے قلم کار اور قارئین، پاکستان اور ہندوستان میں بسنے والے افراد کی تہذیب و ثقافت، طرزِ معاشرت، سماجیات، سیاسیات، ادبیات اور اقتصادیات کے ساتھ ساتھ یہاں کے بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات کا مطالعہ بھی کر رہے ہیں جس سے اُردو زبان کو بھی وسعت ملی ہے اور اُردو ادب کے فروغ کا گراف بھی بڑھا ہے۔ لہٰذا حکومتِ پاکستان اور ادبی اداروں کو اس طرف توجہ دینا ضروری ہے تا کہ اُردو ادب کی شاہ کار تحریروں کے زیادہ سے زیادہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے ہوں اور اُردو کے ناول، افسانے یا دیگر اصنافِ نظم و نثر کا دائرۂ کار قومی سے بڑھ کر بین الاقوامی ہو جائے۔

یہ بات میں اس لیے بھی لکھ رہا ہوں کہ بیس ویں صدی کے لحاظ سے اکیس ویں صدی میں اُردو ناول کی تحقیق اور تنقید کی روایت میں توانائی آئی ہے۔ وہ تن درست و توانا نظر آنے لگی ہے۔ اس کی صحتِ لفظی ہو یا متن و عبارت، ہر اعتبار سے پہلے سے زیادہ تر و تازہ اور شگفتہ ہے۔ اگر ہمارے ہاں اُردو ناول کی تحقیق اور تنقید کا گراف اسی انداز سے بڑھتا رہا اور اس کا ارتقائی سفر عروج

کی طرف اسی طرح جاری رہا تو مغربی ناول کی طرح اُردو ناول کی تحقیق و تنقید کا بڑا سرمایہ جمع ہونے لگے گا جو کسی خزانے سے کم نہیں ہوگا۔ اس سے ایک فائدہ ہماری نئی نسل اور ناول پر ریسرچ کرنے والوں کو ہوگا کہ ان کی درست سمت میں راہ نمائی ہو سکے گی اور انھیں اپنی منزلِ مقصود کا تعین کرنے میں آسانی ہوگی۔ نئے نسل کے تازہ کار اور حوصلہ مند افراد بھی اس راہ کو اپنائیں گے اور یہ سلسلہ یونہی آگے بڑھتا رہے گا جو خوش آیند ہے۔

◆◆◆

اُردو ناول کی ترقی یافتہ شکل

جب ہم نئے ناول کی بات کرتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے میلان کنڈیرا کی کتاب {Art of Novel} ''ناول کا فن'' کا ذکر کرنا پڑے گا، کیوں کہ میلان کنڈیرا نے ناول کے فن سے متعلق ایک نئے زاویے سے اپنی فکر کا اظہار کیا ہے۔ ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔ ناول کا تجزیہ جدید انداز سے کیا ہے اور اس کی تفہیم کے نئے در وا کر دیے ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس نے نئے ناول کے لیے نئی لفظیات قائم کر دی ہیں۔ لہٰذا ہمیں نئے ناول کو سمجھنے کے لیے اس کی نئی تفہیم و تجزیے اور نئی لفظیات کو سمجھنا پڑے گا۔ اس سے قبل کہ ہم میلان کنڈیرا کی کتاب ''ناول کا فن'' پر گفتگو کریں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ناول کا یہ نیا روپ کیوں کر سامنے آیا ہے؟

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں نئے نئے علوم رواج پا رہے ہیں، نئی اور جدید ترین ٹیکنالوجیاں سامنے آ گئی ہیں۔ سائنس کی ترقی نے پورے معاشرے کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا ناول کے نئے معیار اور نئے پیمانے قائم کرنا وقت کے اہم تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کے مطابق ناول لکھا جائے گا تو ہم اسے 'جدید ناول' کہیں گے۔ اس نئے ناول میں نئی زندگی ملے گی، موجودہ معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ملیں گے۔ رسوم و رواج نئے ہوں گے۔ زندگی بسر کرنے کے انداز نئے ہوں گے، زندگی کے تقاضے، ضروریات اور ترجیحات نئی ہوں گی۔ اس ناول کا پلاٹ یعنی واقعات، کردار اور پس منظر نیا ہوگا۔ نیا ماحول منظرِ عام پر آئے گا۔ پھر اس کے تحت جو زندگی ہوگی وہ نئی محسوس ہوگی۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو ادب میں ناول کی صنف زندگی سے زیادہ قریب ہے اور زندگی اور اس کے نشیب و فراز ایک ایسی حقیقت ہیں جس سے نہ تو انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جو ناول نگار زندگی کے تصورات، خیالات اور تخیلات کو جتنا عمدگی اور فن کاری سے حقیقت کے روپ میں پیش کرے گا،

وہ اتنا کام یاب ناول نگار کہلا سکے گا۔ کیوں کہ وہ اظہارِ حقیقت کے ذریعے نئی معلومات میں اضافہ کرتا ہے، زندگی کے کچھ نئے رموز آشکار کرتا ہے اور رازہائے زندگی کے انکشافات سے اپنے ناول کا تانا بانا بنتا ہے جس سے ناول کے معانی و مفاہیم کے روشن امکانات سامنے آتے ہیں۔ ایسے ناول نئے نئے موضوعات لیے ہوتے ہیں جن سے قارئین نئی دنیا اور اس کے مکینوں کے نئے میلانات و رجحانات اور اس سے پیدا ہونے والے تغیرات و تبدل کے اجمالی اظہار سے آشنا ہوتے ہیں۔ یہ آگاہی، قاری کو نئے ناول سے لطف اندوز کرتی ہے اور وہ ناول نگار کی ذہنی اُپج سے متعارف کراتی ہے۔

یہاں ہم نئے اُردو ناول کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اُردو ناول میلان کنڈیرا کے بیان کردہ ناول کے فن پر سو فی صد پورا اُترنے لگا ہے جس کی وجہ سے ہم ہر اُردو ناول کو 'نیا اُردو ناول' کہہ رہے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نئے اُردو ناول میں روایت سے ہٹ کر جو بدلاؤ اور تغیر آیا ہے اس کی وجہ سے ہم اسے 'نیا اُردو ناول' کہہ رہے ہیں۔ بیس ویں صدی کے ابتدائی ناولوں کو سامنے رکھ کر اگر ہم اکیس ویں صدی کے ناولوں کو دیکھیں تو وہ ہمیں ایک دوسرے سے یک سر مختلف اور جداگانہ نظر آتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اکیس ویں صدی میں جو علوم و فنون اور ٹیکنالوجیوں میں اضافہ ہوا، اور تغیرات رونما ہوئے ہیں، ان کے سبب ناول نگار کا ذہن بھی ان سب چیزوں سے متاثر ہوا ہے اور اس نے ان تغیرات کے اثرات کو اپنی کہانی میں داخل کر دیا ہے۔ ناول نگار اپنے ناول کو مؤثر بنانے کے لیے اس میں دل چسپی کا عنصر رکھتا ہے، تحریر کو گنجلک ہونے نہیں دیتا، سادگی کے حسن سے عبارت کو سجاتا ہے، علامت اور تجربے کا دامن چھوڑ کر بیانیے کو اپناتا ہے، جو ناول نگار ان باتوں کا خیال نہیں رکھتا اس کے ناول میں واقعات غیر مربوط، بے ربط تحریر، کرداروں میں تضادات، تحریر میں اُلجھن اور ماحول بے جوڑ ملتا ہے۔ اس کیفیت میں لکھی جانے والی تحریر کچھ اور تو ہو سکتی ہے وہ ناول نہیں۔ ناول میں کہانی آگے چلتی ہے، کردار جیتے جاگتے ہوتے ہیں۔ پس منظر دل کش اور دیدہ زیب ہوتا ہے۔ کرداروں کا باہمی تعلق قابلِ ذکر اور ان کی گفتگو سلیقے مند اور ماحول کے مطابق ہوتی ہے۔ مکالمے نپے تلے اور کرداروں کی آمد و رفت جچی تلی ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایک منظر اور کردار کو چن چن کر پیش کیا گیا ہے۔

اُردو ناول نگاروں میں چند ناول نگاروں کا اُسلوبِ اظہار یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناول کی کہانی کو مکالمہ بازی کی نذر کر دیتے ہیں۔ تمام کرداروں کو مکالمے کے ذریعے اظہارِ گفتگو اور مدعا بیان کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ زیادہ مکالمے بازی ناول کو مذاکرے میں تبدیل کر دیتی ہے، حد سے زیادہ مکالمے ناول کی صورت کو مسخ کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کسی بھی کہانی میں سفلی جذبات کا اظہار اور رقیق خیالات کی بھرمار ناول کی فضا کو مکدر کر دیتی ہے۔ کسی بھی ناول کو ناول نگار اعتدال پسندی اختیار کرتے ہوئے یکساں رفتار پر قائم رکھ سکتا ہے، ناول نگار کا یہ عمل ناول کو ناول رہنے دیتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کہانی کے تقاضے کے مطابق اس میں جذبات کی شدت کا بیان بھی ممکن ہے اور ہیجان خیزی کا امکان بھی بھلا لگتا ہے۔ باقی تمام باتوں کی زیادتی ناول کو تباہ کر دیتی ہے اور اعتدال پسندی اس کے حسن کو نہ صرف برقرار رکھتی ہے بلکہ اس کے حسن میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ یہاں میں اس زرگر کی مثال پیش کروں گا جس کے ہاتھوں میں سونے کو زیور بنانے کا ہنر ہوتا ہے۔ ایک ماہر زرگر کی فن کارانہ اور ماہرانہ ضرب سونے کو زیور کے سانچے میں ڈھالتی چلی جاتی ہے اور ہلکی یا تیز ضرب سونے کا حلیہ اتنا بگاڑ دیتی ہے کہ وہ زیور کہلانے کا حق نہیں رکھتا۔ زرگر کی مہارت، فن اور اس کی ریاضت کی بنا پر کوئی بے شکل سونا خوب صورت اور حسین و جمیل زیور کا پیکر اختیار کرتا ہے۔ اس میں سونے کی نہیں زرگر کی تعریف ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی ناول میں مشاہدات، جذبات، احساسات، مکالمہ نگاری اور تجربات کی زیادتی ناول کی صورت بگاڑ دیتی ہے اور ذہین و فطین اور زیرک و طباع ناول نگار کی مہارت، ریاضت اور اس کا فن ناول کی تحریر میں جان ڈال دیتا ہے۔ ناول نگار کی اس قسم کی ذہانت ہی اس کی تحریر کا قارئین میں اعتبار قائم کرتی ہے اور خود کو بار بار قرأت کی دعوت دیتی ہے۔

یہاں میں کچھ مشاہیرِ اُردو ادب کو ناراض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ وہ اکثر ناقص، جھول دار اور کم زور ناولوں کی تعریف میں اس طرح زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ ان سے بہتر کوئی اور تحریر نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ سمجھ آتی ہے کہ آج کا نقاد مصلحت پسندی، دوغلا پن اور جانب داری سے کام لے رہا ہے۔ وہ ناول نگار کے عہدے، شخصیت اور مالی حیثیت سے مرعوب ہوتا ہے اور مالی منفعت کے لالچ میں اس کی کم زور تحریر کو اعلیٰ نمونہ قرار دینے کے لیے کاغذ کالے

کردیتا ہے اور اپنے نام کی شہرت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اپنی تحریروں کو مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع بھی کرادیتا ہے اور کتاب میں بھی شامل کرلیتا ہے۔ اس رویے سے وہ سمجھتا ہے کہ قارئین کو گم راہ کردے گا اور مالی منفعت حاصل کرلے گا۔ یہ تو حقیقت ہے کہ اسے مالی منفعت اور وقتی شہرت تو حاصل ہوجائے گی، مگر قارئین پر اس کا داؤ نہ چل سکے گا، کیوں کہ قاری جب کسی تحریر کو پڑھتا ہے تو وہ وقتی طور پر تحریر سے ناول نگار کا نام حذف کرکے مطالعہ کرتا ہے اور اس میں ناول کے اجزائے ترکیبی کے ساتھ ساتھ ناول کو ناول بنانے والے لوازمات تلاش کرتا ہے۔ اگر اسے ناول میں عمدہ پلاٹ، واقعات کی ترتیب، کرداروں کا باہمی تعلق، ماحول کے مطابق پس منظر، عمدہ کہانی اور اچھا اختتام ملتا ہے تو وہ اسے اچھا ناول قرار دیتا ہے، ورنہ رد کردیتا ہے۔ اب اس کے سامنے نہ تو ناول نگار کا عہدہ ہوتا ہے اور نہ اس کی شخصیت، قاری کے سامنے جب ناول نگار کا نام ہی نہیں ہوتا تو اس کی مالی حیثیت پر نظر جاتی ہی نہیں۔ ایسے ناول کو پڑھنے کے بعد قاری کے دل سے جو آواز نکلتی ہے وہ بڑی سچی ہوتی ہے۔

کچھ عرصے قبل فکشن کے خلاف کافی نعرے بازی کی گئی، زوال پذیری کا طعنہ دیا گیا، اس کے عہد کو عہدِ ردی کہا گیا۔ اس کی ایک وجہ ہمارے نقاد کی جانب داری تھی جس کی وجہ سے کم زور تحریریں بھی شہ پارہ کے عنوان سے شائع ہوتی رہیں۔ مگر آج کا قاری نئے زمانے کا قاری ہے۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں تحریری مطالعہ کرتا ہے اور اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہتا ہے۔ اسی طرح ان نقادوں پر انگلیاں اُٹھائی جاتی ہیں جنھوں نے اس تحریر کو معرکہ آرا قرار دیا ہوتا ہے۔ ایسے مشاہیر پر سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ لہٰذا قاری ایسے نقادوں کی رائے سے بے زار ہوجاتے ہیں کہ وہ ان کی نظر میں اعتبار کھودیتے ہیں۔

پاکستان میں جب نئے اُردو ناول کا تذکرہ آتا ہے تو متعدد ناول نگاروں کے نام ہمارے سامنے آجاتے ہیں، جن میں مستنصر حسین تارڑ، خالدہ حسین، اسد محمد خان، نکہت حسن، نسیم انجم، مرزا اطہر بیگ، محمد امین الدین، اے خیام، علی اکبر ناطق، قرۃ العین طاہرہ، مرزا حامد بیگ، نعیم بیگ، حسن منظر، محمد حامد سراج، طاہرہ اقبال، یونس جاوید، مصطفیٰ کریم، عبداللہ بیگ، عاصم بٹ، محمد الیاس اور رفاقت حیات وغیرہ شامل ہیں۔ ان ناول نگاروں نے جو اکیس ویں صدی میں ناول لکھے ان میں جدت بھی ہے اور ندرت بھی۔ معانی بھی ہیں اور مفاہیم بھی۔ ان کی کہانیاں دہ

طلوع ہونے والا آفتاب ہے جس کی روشنی سے اندھیروں کا خاتمہ ہوتا ہے اور دن کا اجالا پھیل جاتا ہے۔ نئے اُردو ناول کا اجالا قارئین کے اذہان و قلوب کو منور کررہا ہے۔ ان کے سامنے نئی دنیا میں لاتا ہے، چاہے وہ ٹیکنالوجی کی دنیا ہو، یا سائنسی علوم کی، نیا معاشرتی ماحول ہو یا جدید افکار و خیالات، اب قاری نئے ناولوں کے ذریعے دنیا کی دیگر اقوام سے بھی متعارف ہورہا ہے اور ان کی تہذیب و ثقافت سے بھی، ان کے رہن سہن سے بھی واقفیت پیدا کررہا ہے اور ان کے رسوم و رواج کے بارے میں بھی جان رہا ہے۔ عالمی تناظر میں لکھا جانے والا ادب بھی اس کے سامنے ہے اور نئے معیارات اور نئے پیمانوں پر بھی اس کی نظر ہے۔ اب کوئی لکھاری پرانی کتاب پر نیا ٹائٹل چڑھا کر قاری کو گم راہ نہیں کرسکتا۔ اب نقاد بھی محتاط ہوگئے ہیں۔ ورنہ ان کی تنقید و تحقیق کی قلعی کھل جائے گی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے وطنِ عزیز کے متعدد ممتاز ناول نگاروں نے نام و نمود کی خواہش اور نام وری و شہرت کے لالچ سے ماورا ہوکر اچھے ناول ہمارے معاشرے کو دیے ہیں۔ انھوں نے جدید رجحانات اور آج کے انسان کے میلانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے ناولوں کا تانا بانا بنا ہے۔ اس میں انھوں نے نہ صرف معاشرے میں بڑھتے ہوئے کرپشن، بے راہ روی، خواتین کی عزت کی پامالی، رشوت، جھوٹ چغلی، غیبت، ملاوٹ، دھوکا دہی، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری اور سیاسی قلابازیوں کی نشان دہی کی ہے، بلکہ ان کا حل بھی پیش کیا ہے۔ ایک اچھا ناول نگار کسی بھی تصویر کے ان زاویوں پر بھی نظر رکھتا ہے جو عام افراد کی نظر سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہمیں کسی بھی تصویر کے دو یا تین پہلو تو نظر آتے ہیں، مگر چوتھا پہلو نظر سے اوجھل ہوتا ہے۔ ناول نگار اس چوتھے پوشیدہ پہلو کے محاسن و معائب بھی اجاگر کرکے پیش کرتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور ہم پوشیدہ پہلو کے بارے میں بھی آگاہ ہوجاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس پہلو کے نقائص سے آشنا ہوجاتے ہیں اور حتی المقدور اسے نقائص سے پاک کرنے کی سعی کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے محاسن سے ہم کوئی فائدہ اُٹھانا چاہیں تو اُٹھا سکتے ہیں۔

ان تمام باتوں، بحث و مباحث اور بیانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سب سے اہم یہ بات قرار پاتی ہے کہ ناول کا سب سے اہم مسئلہ تحقیق کی سطح پر اس کا ناول ہونا ہے۔ اگر کوئی ناول

انسان اور اس کی زندگی کی سرحدوں کو نہیں چھوتا یا وہ انسان اور اس کے معاشرے پر بحث نہیں کرتا، اس کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، رسوم و رواج، معاشیات، معاشرت، سماجیات، اقتصادیات، عمرانیات، نفسیات، سیاسیات اور ادبیات کا ذکر نہیں کرتا تو ہم اسے ناول یا اچھا ناول نہیں کہہ سکتے۔

ناول کی اچھی بُنت کے لیے ناول نگار کا مشورہ کام نہیں کرتا، بلکہ جو اس نے زندگی کے نشیب و فراز کی تصویر کشی کی ہوتی ہے، وہی ناول میں زندگی پیدا کرتی ہے۔ انسان اور اس کی زندگی کی بچی تصویریں جتنی خوب صورت، دل کش اور حقیقت سے قریب تر ہوں گی، ناول اسی قدر جان دار اور متاثر کن ہوگا۔ اب یہ ناول نگار کے فن پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کو کتنے زاویوں سے دیکھتا ہے اور اس کی تشریح و تفسیر کن اسالیبِ اظہار سے بیان کرتا ہے۔ زندگی کے اہم مسائل اور بڑی دشواریوں سے تو سبھی واقف ہوتے ہیں، مگر ناول نگار مسائل و وسائلِ زندگی کی جزویات بیان کرتا ہے۔ وہ تصویرِ زندگی کے وہ گوشے اجاگر کرتا ہے جو عام انسانی نظر سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہی کسی اچھے ناول نگار کی خوبی ہوتی ہے جو کہانی میں دل چسپی اور معلومات کا عنصر پیدا کرتی ہے۔ جو ناول نگار over smart بننے کے چکر میں ایسی ایسی باتیں کہانی میں لے آتا ہے جن کا تعلق زندگی کے کسی پہلو، گوشے اور زاویے سے نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس طرح وہ اپنی مرضی و منشا سے کہانی کے کرداروں کو جہاں چاہتا ہے دکھاتا ہے، جو بات چاہتا ہے ان سے کہلواتا ہے اور جہاں چاہتا ہے ان کو لے جاتا ہے، اس کی یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ اس کی قلابازیاں ناول کو اچھوتے انداز سے ہم آہنگ کرتی ہیں اور دوسرے ناول نگاروں سے اسے منفرد و ممتاز کرتی ہیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ ناول نگار اپنے کرداروں کو تو اپنی مرضی و منشا اور ارادے کے مطابق حرکات و سکنات سے آراستہ کرسکتا ہے، مگر وہ قاری کو کسی طرح بھی بہکا نہیں سکتا۔ قاری اسی کہانی کے ساتھ ساتھ چلتا اور آگے بڑھتا ہے جس میں اسے حقائق کا گمان ہوتا ہے۔ جہاں تک قاری کو زندگی کی سچائیاں نظر آ رہی ہوتی ہیں وہاں تک وہ کہانی اور کہانی کار کا ساتھ دیتا ہے، مگر جب اسے احساس ہو جائے کہ اب اس کی کہانی کا کردار حقائق کی ڈگر سے اُتر کر خیالی شاہ راہ پر چلنے لگا ہے اور کہانی میں مافوق الفطرت اور ماورائی مخلوقات کی کرشمہ سازیاں شروع ہوگئی ہیں تو وہ ناول سے نظریں ہٹا لیتا ہے اور کہانی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اس کی رائے ناول کے متعلق مثبت نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ جب کسی فلم کا 'پریمیئر شو' دکھایا جاتا ہے تو ناظرین فلم دیکھنے کے بعد اس کی کام یابی و کامرانی کی بات اسی صورت میں کرتے ہیں جب وہ زندگی کی حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ کسی فلم کی کہانی میں اندھیرے میں تیر چلانے اور تکا مارنے سے کام نہیں چلتا، بلکہ فلم فلاپ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی ناول کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اچھا اور کام یاب ناول لکھنے کے لیے ناول نگار کو اپنے تلخ و شیریں تجربات کی روشنی سے کام لینا ہوگا۔ اپنے عمیق مشاہدات سے اہم واقعات کو ترتیب وار پیش کرنا ہوگا۔ زندگی کا مطالعہ بہ نظرِ غائر کرنا ہوگا۔ انسان اور اس کے مسائل سے آشنا ہونا ہوگا۔ اپنے علم کو وسعت دینی ہوگی۔ عالمی ادب سے باخبر رہنا ہوگا۔ بدلتے ہوئے حالات اور معاشرہ و سماج میں سانس لینا ہوگا اور پھر ان تمام باتوں کا نچوڑ نہایت فن کاری سے ناول میں پیش کرنا ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناول ایک مشکل صنفِ ادب ہے، مگر مذکورہ باتوں پر عمل کرنے سے اس مشکل کو آسان کیا جا سکتا ہے۔ اس دشواری سے آسانی کے ساتھ گزرا جا سکتا ہے۔ ہمارے اسلاف ناول نگاروں نے ایسا ہی کیا تھا۔ تبھی تو آج تک ان کی تحریروں کو پڑھا جا رہا ہے، کوٹ کیا جا رہا ہے اور کوئی بھی ناول یا ناول نگاروں کا تذکرہ ان کے ناموں کے بغیر ادھورا تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی ناول نگار یہ چاہتا ہے کہ وہ اچھے ناول لکھے جنھیں برس ہا برس یاد رکھا جائے اور اس کی تحریر کا مقصد اسے ملے تو وہ مذکورہ نکات پر عمل پیرا رہے تاکہ اسے فن کی معراج حاصل ہو سکے۔

مزید اچھے ناول لکھنے کے لیے چند باتیں اور میرے ذہن میں اُبھر رہی ہیں جن کا بیان کرنا بہتر ہے۔ ناول کی کہانی کو زندگی سے قریب تر کرنے کے لیے ہمیں اس کے کرداروں پر تحقیق کرنا ہوگی اور خوب خوب تحقیق کر کے اصل حقائق اور مواد جمع کرنا ہوگا، تب کہیں جا کر ایک ایسا ناول لکھا جا سکے گا جس میں جذباتیت بھی ہوگی اور تخلیقیت بھی، اس میں حقیقت بھی ہوگی اور بصیرت بھی۔ کرداروں کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنا، ان کے مسائل سے آگاہ ہونا، ان کے درد کو اپنا درد سمجھنا، ان کی تکلیف کو محسوس کرنا، ان کے رنج و غم اور حزن و ملال کو محسوس کرنا، ایک ناول نگار کے فرائض میں شامل ہے۔ ناول نگار اپنے ان فرائض سے جتنا اور جس قدر عمدگی اور محنت سے سبک دوش ہوگا ناول اتنا ہی جان دار تیار ہو سکے گا۔

میں بہ حیثیت ناول نگار اس روش کو اپنا تا رہا ہوں۔ میں اپنے ناولوں کے اکثر کرداروں تک

چل کر گیا ہوں۔ ان سے بات کی ہے۔ ان کے اندر جھانکا ہے، ان کے دل میں اُتر کر دیکھا ہے۔ ان کے غم کو اپنا غم سمجھا ہے۔ ان کے دکھ درد کو محسوس کیا ہے۔ ان کی خواہشات کا احترام کیا ہے۔ ان کے ارمان، اُمنگیں اور اُمیدیں نوٹ کی ہیں۔ ان کے مسائل کو سنا ہے اور ان کے وسائل پر توجہ کی ہے۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں جو ناول لکھے وہ بہتر قرار پائے۔ ہر ناول نگار کو یہی کرنا چاہیے یعنی کہانی میں حقیقت کا پکا رنگ بھرنا چاہیے۔ افسانوی حقیقت اور تخلیقی وجدان سے کام لینا چاہیے تا کہ کہانی میں سوز و گداز، ندرتِ خیال اور حقائق کی چاشنی نظر آئے۔ ناول کو تجربات و مشاہدات کا پیکر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اس کا ناول، ناول نہیں بلکہ ناول کی تاریخ معلوم ہوگا جس میں فقط کرداروں کے نام، جگہیں، عمارات اور بے ہنگم واقعات ہی ہوں گے۔ ایک مدت پہلے ایسے ناولوں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ناول سے کہانی پن ختم ہو گیا ہے۔

جہاں تک اکیس ویں صدی کے ناولوں کا ذکر آتا ہے تو میں یہ بات بڑے وثوق سے لکھ سکتا ہوں کہ نئے اُردو ناول میں کہانی پن بھرپور انداز میں موجود ہے۔ پاکستان میں اکیس ویں صدی میں شائع ہونے والے ناولوں کی فہرست دی جا رہی ہے جس میں سے اکثر آپ نے پڑھے بھی ہوں گے:

پاکستان میں اکیس ویں صدی میں شائع ہونے والے اُردو ناول

ناول	مصنف	سال
قربتِ محبت میں مرگ	مستنصر حسین تارڑ	2001ء
دائرہ	محمد عاصم بٹ	2001ء
گھر تو آخر اپنا ہے	وحید عزیز	2001ء
کاغذی گھاٹ	خالدہ حسین	2002ء
حاصلِ گھاٹ	بانو قدسیہ	2003ء
جاگنگ پارک	نکہت حسن	2007ء
نرک	نسیم انجم	2007ء
کہر	محمد الیاس	2007ء
تانیہ	وحید عزیز	2007ء

ناول	مصنف	سال
غلام باغ	مرزا اطہر بیگ	2008ء
دھنی بخش کے بیٹے	حسن منظر	2008ء
گہرا زخم	شاعر علی شاعر	2009ء
کراچی والے	محمد امین الدین	2009ء
آشوب گاہ	محمد حامد سراج	2009ء
مٹی کی سانجھ	طاہرہ اقبال	2009ء
خس و خاشاک زمانے	مستنصر حسین تارڑ	2010ء
اندھیرے ہونے سے پہلے	نجمہ سہیل	2010ء
کنجری کا پل	یونس جاوید	2011ء
ماروی اور مرجینا	نجم الحسن رضوی	2011ء
زینو	وحید احمد	2012ء
عجب نصیبی	سید ثروت ضحیٰ	2012ء
سراب منزل	اے خیام	2013ء
گلیوں کے لوگ	اقبال حسن خان	2014ء
پتوار	نسیم انجم	2014ء
آہٹ	نسیم انجم	2015ء
اے جذبۂ دل گر تو چاہے	پروفیسر خیال آفاقی	2015ء
یہ عشق نہیں آساں	وحید عزیز	2015ء
گرداب	سید سعید نقوی	2016ء
یہ راستہ کوئی اور ہے	اقبال حسن خان	2016ء
میرواہ کی راتیں	رفاقتِ حیات	2016ء
نولکھی کوٹھی	علی اکبر ناطق	2016ء
چینی جو میٹھی نہ تھی	صفدر زیدی	2016ء
تلاشِ وجود	اسلم سراج الدین	2016ء

محمد شاہ کا ٹانگہ	علی اکبر ناطق	2017ء
سرِ بازار رقصاں	نسیم انجم	2017ء
ڈیوس اور علی بابا	نعیم بیگ	2017ء
نیلی بار	قرۃ العین طاہرہ	2018
انارکلی	مرزا حامد بیگ	2018
چار درویش اور ایک کچھوا	سید کاشف رضا	2018ء
محبت مر نہیں سکتی	وحید عزیز	2018ء
خواب گاہ	شاعر علی شاعر	2018ء

ان ناولوں میں اکثر ایسے ناول بھی ہیں جو خوب صورت اور معیاری تحریر لیے ہوئے ہیں جن میں واقعات کی ترتیب بھی ہے اور کرداروں کا متناسب تعلق و مکالمہ بھی۔ جن میں پس منظر بھی ہے اور عمدہ ماحول میں کردار سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ کہانی پن کا حسن ان کی اضافی خوبی ہے۔ میں ان ناولوں کو نئے اُردو ناول اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان میں ناول نگار نے اپنے عہد کی ترجمانی بھی کی ہے اور اپنے معاشرے کی عکاسی بھی، یہ نیا اُردو ناول مغربی ناول کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی شان و شوکت رکھتا ہے۔ ہم اس نئے اُردو ناول کو دیگر زبانوں میں ترجمہ ہونے کی صلاحیت سے مالا مال پاتے ہیں۔ شاید انھی خصوصیات کی بنا پر ہندوستان کے معروف نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اکیس ویں صدی کو ''ناول صدی'' کا نام دیا ہے۔ 'نیا اُردو ناول' اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں نئے مفاہیم و معانی کی معلومات بھی ہے اور نئے انکشافات بھی۔ حقائق کو افشا بھی کیا گیا ہے اور مستقبل کے عرفان کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ حقیقتیں کھل کر بیان کی گئی ہیں اور سب سے بڑھ کر ان میں زمانے کے عروج و زوال، نشیب و فراز اور محاسن و معائب کا کھل کر بیان ملتا ہے۔ ہمیں نئے اُردو ناول کے مطالعے سے یہ اندازہ بہ خوبی ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اس نئے ناول میں اپنے تمام تر تلخ و شیریں تجربات سے فائدہ اُٹھا کر ان کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اس نے شعور سے کام لے کر اپنے لاشعور میں محفوظ معلومات کو الفاظ کے پیرائے میں صفحۂ قرطاس پر پینٹ کر دیا ہے۔ اُلجھاؤ کو سلجھایا ہے۔ مشکلاتِ زندگی کو آسان کیا ہے۔ دشوار گزار راہوں کو آسان اور ہموار کیا ہے۔ اندھیروں میں اُمید کی شمعیں روشن کی ہیں۔ تاریک گوشوں کو اجالا ہے۔ ذہن کی تاریکی

کو منور کیا ہے۔ نہ صرف دنیا کو درپیش مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے، بلکہ ان مسائل کا حل بھی پیش کر دیا ہے۔ رموزِ کائنات اور اسرارِ زندگی کی تشریح و تفسیر اور وضاحت اپنے علم کے مطابق بیان کر دی ہے۔ یہ حقیقت ہے انسان کا علم جس قدر محدود ہے، ان کی نظر جہاں تک دیکھتی ہے اور اس کا ذہن جہاں تک سوچتا ہے وہ وہاں تک کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنی طاقت سے زیادہ کام نہیں کر سکتا، مگر ایک اچھا ناول نگار اپنے علم و فن کی روشنی میں اہم اور ضروری واقعات کو کہانی بناتا ہے اور عبارت میں دل چسپی و دل کشی اور رنگینی پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی صفات و خصوصیات کا پیکر تراشتا ہے۔ ماحول ساز گار رکھتا ہے اور کرداروں میں باہمی تعلق پیدا کر کے ان میں گفتگو کی چاشنی پیدا کرتا ہے۔ پس منظر میں قاری کو وہاں وہاں لے جاتا ہے جہاں جہاں کہانی کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس لیے قاری اس کی کہانی کے شانہ بہ شانہ اور قدم سے قدم ملا کر چلتا رہتا ہے۔ اگر قاری اور کہانی کا یہ سفر ایک ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے تو ناول کام یاب قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر قاری یکسانیت کا شکار ہو، بوریت محسوس کرے، اُلجھاؤ سے اس کا ذہن پراگندہ ہو جائے، واقعات کی بے ترتیبی سے وہ بے زار ہو جائے، مافوق الفطرت واقعات اور ماورائی کردار نظر آنے لگیں تو وہ کہانی کے ساتھ مزید ایک قدم نہیں بڑھاتا۔ وہ راستہ ترک کر کے واپس لوٹ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم ناول کو فلاپ ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور یہی ناول نگار کی ناکامی ہوتی ہے۔

کام یاب اور اچھا ناول وہ ہوتا ہے جس میں کسی شے کو دریافت کیا جاتا ہے، کسی جذبے کو اُبھارا جاتا ہے، کسی عمل کو کر کے دکھایا جاتا ہے۔ زندگی کے مختلف زاویوں، گوشوں اور پہلوؤں کے نئے نئے انکشافات کیے جاتے ہیں، زندگی کی سچی تصویروں کو عمدگی سے پیش کیا جاتا ہے، فطرت کی گہرائیوں اور اصل حقیقت کو پہچانا جاتا ہے جس کی بنا پر انسان فطرت سے قریب تر ہو کر خودی کی پہچان کرتا ہے اور جب انسان خود کو پہچان لیتا ہے تو کائنات کے خالق اور انسانوں کے مالک کی حقیقت پا جاتا ہے، اور اپنے بنانے کے مقصد کو پہچان لیتا ہے۔ پھر وہ اپنی کہانیوں کی بنیاد 'حقیقت کی تلاش' پر رکھتا ہے جس سے حقائق آشکار ہونے لگتے ہیں، انکشافات سامنے آنے لگتے ہیں، نئے جہانوں کی دریافتیں ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح وہ فطرت کی اصل تک پہنچا جاتا ہے۔ پھر ناول نگار اپنی کہانی میں دنیا بھر کے مسائل پیش کر کے اصلیت یعنی فطرت کی طرف لوٹتا ہے اور

قاری کے ذہن ودل پر ایک سبق آموزی کا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

میں یہاں اچھے اور برے ناول کے بارے میں ایک نقاد کا قول تحریر کرتا ہے جو قابلِ ذکر ہے، ''اچھا ناول اپنے ہیرو کا حال سچائی سے بیان کرتا ہے، لیکن برا ناول اپنے مصنف کا حال سچائی سے بیان کرتا ہے۔''

المختصر اگر ناول کے بارے میں مختصر جملہ پیش کیا جائے تو وہ یہ ہوسکتا ہے کہ انسان اور اس کی زندگی کی جزیات نگاری ناول کہلاتا ہے اور نئے اُردو ناول میں انسان اور اس کی زندگی کو مرکزیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس لیے ہم نئے اُردو ناول سے مطمئن بھی ہیں اور مزید بہتر ہونے کی قوی اُمیدیں بھی وابستہ کر رہے ہیں۔ اکیس ویں صدی اور نیا اُردو ناول ایک دوسرے کی پہچان بن رہے ہیں۔

◆◆◆

نئ صدی میں اُردو ناول

(پاکستان کے حوالے سے)

اکیس ویں صدی کے ابھی سترہ برس ہی گزرے ہیں مگر ان سترہ برسوں میں اُردو ناول جس تسلسل اور تواتر سے منظرِ عام پر آئے ہیں وہ تعداد حیران کن ہے۔ 2001ء سے اُردو ناول کا سلسلہ شروع ہوا اور 2017ء تک متعدد اُردو ناول نہ صرف لکھے گئے بل کہ اشاعت پذیر بھی ہوئے۔ ناول نگاروں کی تحریروں نے اکیس ویں صدی کے ابتدا ہی سے اُردو کے افسانوی ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔ یہ سلسلہ ان سترہ برسوں میں رُکا نہیں اور نہ مدھم ہوا ہے بل کہ ابھی تک جاری و ساری ہے اور کسی نہ کسی قلم کار کا ناول منظرِ عام پر آتا رہتا ہے۔ جہاں اس صدی میں ناولوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے وہاں ان کا معیار بھی بلند ہوا ہے۔ متعدد ناول ایسے بھی ہیں جن کو ہم ناقابلِ فراموش کہہ سکتے ہیں کیوں کہ انھوں نے قارئین کے اذہان وقلوب کو متاثر کیا ہے۔ ان ناولوں کی تعریف میں لکھے گئے مضامین، تبصرے اور ناقدینِ فن و ہنر کی مثبت آرا اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ یہ اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہی نہیں بل کہ تاریخِ اُردو ادب کا حصہ بھی ہیں۔ ادبی رسائل وجرائد میں ان ناولوں کی توصیفی گونج سنائی دی ہے جو قارئینِ اُردو ادب کی سماعت کو بھلی معلوم ہوئی ہے۔ یہ گونج بازگشت کی طرح بار بار پلٹ آتی ہے جس سے نہ صرف ناول بل کہ ناول نگار کا نام بھی ازبر ہو جاتا ہے اور اس کی قلم کاری کے اوصافِ حمیدہ بھی ذہن نشین ہو جاتے ہیں کیوں کہ تخلیق سے تخلیق کار کی پہچان ہوتی ہے۔

اکیس ویں صدی میں لکھے جانے والے ناولوں کے تجزیے سے ہمیں خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ ان سترہ برسوں میں تقریباً 140 سے زائد اُردو ناول شایع ہو چکے ہیں جنھوں نے اُردو

داب کے دامن کو وسیع سرمائے سے بھر دیا ہے۔ یہ تعداد عالمی سطح پر ریکارڈ کی گئی ہے۔ اس میں اُردو کی نئی بستیوں، ہندوستان یا پاکستان کی تخصیص نہیں ہے۔

ناول کسی بھی سماج اور معاشرے کے حالات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس میں معاشرتی مسائل، سماجی رویئے، انسانی کردار، سیاسی حالات، ذرائع ابلاغ، طرزِ معاشیات اور ان سب مسائل اور ان کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ مسائل کے حل پر ناول نگار ایک کہانی کے انداز میں بحث و مباحثہ کرتا ہے اور طنز سے بھی کام لیتا ہے۔ وہ مسائل کی نشان دہی بھی کرتا ہے اور اپنے علم کے مطابق ان مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے۔ مسائل کے حل پیش کرنے میں سبھی ناول نگار طاق نہیں ہوتے، جو ناول نگار ایسا کرتا ہے وہ دیگر ناول نگاروں سے منفرد و ممتاز نظر آتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں اس معاشرے کے سدھارنے کے امکانات بھی ہیں اور ان کے مسائل کا حل بھی۔ وہ دور اندیشی سے کام لے کر ممکنات کی بات بھی کرتا ہے۔ یعنی ناول نگار اپنے ملک و معاشرے میں موجود سیاسیات، معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات اور ادبیات کا بھرپور جائزہ لیتا ہے۔ جب ہم اپنے بہت پہلے کے زمانوں اور ادوار میں لکھے گئے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس زمانے کی معاشرت، سیاست، ادب، تہذیب و ثقافت، تمدن اور معاشیات کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ آپ کسی بھی زمانے کا ناول اُٹھا لیں آپ کو اس زمانے کی حکومت، شجاعت، امانت، معاشرت اور انسانی کرداروں اور رویوں کا علم ہو جائے گا۔ اس زمانے کی سائنسی ترقی اور اخلاقی گراوٹ کی تصویریں بھی آنکھوں کے سامنے آجائیں گی۔ ناول ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی بدولت کسی عہد کے خارجی اور داخلی حالات سے بہ خوبی واقف ہو سکتے ہیں اور یہ حقائق نوے فی صد سچ اور درست ہوتے ہیں۔ کیوں کہ حکمران تاریخ نویسی میں مداخلت کر کے تاریخ کو توڑ مسخ کر سکتے ہیں، اپنی مرضی کی تاریخ مورخ سے لکھوا سکتے ہیں، انعام و اکرام یا دھمکی دے کر...... مگر ناول نگار کسی کے تابع نہیں ہوتا۔ وہ ایک سچا قلم کار ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کا عینی شاہد ہوتا ہے، وہ اپنے تمام تر تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، نازک احساسات اور محسوسات کو الفاظ کا روپ دے کر قرطاس پر پینٹ کر دیتا ہے۔ ایک اچھا ناول نگار اپنی تحریر میں انسان، انسان کی زندگی، انسانی زندگی کے نشیب و فراز، انسانی کرداروں کی منفی و مثبت جھلک، زمانے کا سرد و گرم، اُتار چڑھاؤ، گردشِ ایام، گردشِ دوراں، شکست و ریخت کے سلسلے، حکومتوں کا عروج و زوال، لوٹ

کھسوٹ، مار دھاڑ، بدعنوانیاں، ہٹ دھرمیاں، روایت شکنی، روایتوں کی پاس داری اور معاشرے کے بدلتے رجحانات و میلانات اور ثمرات و تبدیلی کو بڑی چابک دستی سے سمو دیتا ہے۔ وہ باتوں ہی باتوں میں اپنا مدعا بیان کر جاتا ہے۔ ناول نگار خود کچھ نہیں کہتا بلکہ اس کے ناول کے کردار تمام تر تہذیب و ثقافت اور تمدن کی عکاسی اپنے جملوں کے ذریعے کرتے چلے جاتے ہیں۔ ناول نگار اس قدر زیرک اور طباع ہوتا ہے کہ اس زمانے کی ادبی تحریکات کے اثرات اور ان سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کی نشان دہی بھی کر دیتا ہے۔ وہ اس قدر سلیم الحواس ہوتا ہے کہ معاشرے میں موجود اور آنے والے خطرات و خدشات کو پہچان لیتا ہے۔ وہ حکمرانوں کے کالے کرتوت بھی بیان کر دیتا ہے اور اقتدار میں آنے کے لیے سازشوں کا بُنا جال بھی دکھا دیتا ہے۔ جس طرح تنقید نگار کسی فن پارے کی تمام تر خوبیاں اور خامیاں الگ الگ کر کے رکھ دیتا ہے اسی طرح ناول نگار دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دیتا ہے۔

اکیس ویں صدی کی ناول نگاری میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ سائنسی ایجادات کے بھرپور استعمال کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان سترہ برسوں میں جس قدر انٹرنیٹ، موبائل فون، فیس بک اور ای میل سے کہانیوں نے جنم لیا ہے وہ ایک جدید انداز اختیار کر گیا ہے۔ یہ زمانہ انتہائی ترقی یافتہ ہے۔ اس عہد میں چشم زدن میں واقعات رونما ہوتے ہیں اور پلک جھپکتے میں دنیا بدل جاتی ہے۔ انسان پاکستان میں بیٹھ کر پوری دنیا سے رابطے میں آجاتا ہے اور ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھے شخص کو نہ صرف دیکھ سکتا ہے بلکہ اس سے بات چیت بھی کر لیتا ہے۔ اس آب و ہوا اور فضا نے ناول نگاری کو بھی متاثر کیا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ایک پیغام بھیجنے کے لیے قاصد کی منت کی جاتی تھی اور پھر وہ قاصد روانہ ہوتا تھا۔ محبوب کا مکان تلاش کرتا تھا، چوری چھپے اس تک پہنچتا تھا اور پھر اس کا جواب لے کر آتا تھا جس میں کئی دن اور بعض اوقات کئی ہفتے لگ جاتے تھے۔ مگر پھر بھی شک رہتا تھا کہ قاصد گیا یا نہیں، یہ جواب محبوب کا ہے یا اس نے خود لکھ کر لوٹا دیا ہے۔ موبائل فون، ای میل اور انٹرنیٹ نے ان شکوک و شبہات کو بھی دور کر دیا ہے۔ اب انسان خود اپنے مخاطب سے بات کرتا ہے، آواز پہچانتا ہے، اس کے لب و لہجے کو جانتا ہے اور فوراً جواب حاصل کر کے آئندہ کا لائحۂ عمل اختیار کرتا ہے۔ اس برق رفتاری نے اُردو ناول کو بھی تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اس میں دقیانوسی خیالات، غیر مرئی قوتوں کی کہانیوں اور مافوق الفطرت باتوں کی گنجائش نہیں رہی۔

اُردو ادب نے بھی ان تبدیلیوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے، لہٰذا آج کے ناول نگار ادب میں بدلتے حالات، تغیر پذیر رجحانات، سائنسی ایجادات کے میلانات اور احوال و آثار کے سہارے ناول نگاری کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں۔ فی زمانہ منفی و مثبت اثرات کو قبول کرنا، انہیں ادب کا موضوع بنانا، تغیر و تبدل کو اپنی تحریروں میں جگہ دینا عام رواج ہو گیا ہے۔

اکنافِ عالم سے پیدا ہونے اور موصول ہونے والے مسائل و عوامل جو تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنتے ہیں ان کو زیرِ بحث لایا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ناول نگاری نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا ہے۔ اس نئے پن میں حادثات، سانحات، وسائل و مسائل، نفسیاتی بیماریوں، اخلاقی زبوں حالی، کردار کی پستی، انسان کی خود غرضی، مطلب پرستی، روایت کی بازیافت، اشتراکی خاندانوں کے فوائد، حقوقِ نسواں، نسواں کی آزادی کے مضر اثرات، تعصبات، نسلی تصادم، اقوام کی درجہ بندی، لسانی جھگڑے، علاقائی عصبیت، ذرائع ابلاغ کا انسانی زندگی پر عمل دخل، معاشرے میں ناانصافی، غیر منصفانہ رویہ، بے روزگاری، بے راہ روی، جنسی تشدد، سیاسی جبر، زندگی کے نشیب و فراز، تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، فرقہ واریت، ملائیت، خواتین سے زبردستی، خواتین کی عریانیت، نوجوان میں بڑھتا ہوا انتشار، تشدد آمیز فکر، امن و امان کی صورتِ حال، محکمہ جات میں سفارش، رشوت اور اقربا پروری اور انسان کی بے ثباتی کو آج کے ناول میں بیان کیا جا رہا ہے۔

اس لیے ہم اکیس ویں صدی میں ان موضوعات کے تحت لکھے جانے والے ناولوں کو سماجی، رومانی، تہذیبی، سیاسی، اصلاحی، جنسی، اخلاقی اور سوانحی ناول کا نام دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ آج کے قارئین کے اذہان میں ان تصورات کی تصویریں بن جاتی ہیں اور وہ قارئین کو ان موضوعات کے مختلف پہلوؤں سے آشنا کرتی ہیں۔ ان کے گوشوں کو اُجاگر کرتی ہیں اور ان اطراف کو منظرِ عام پر لاتی ہیں جو انسانی آنکھ سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان نئے اسالیبِ اظہار نے اُردو ناول کو نہ صرف ترقی کے راستے کا مسافر بنا دیا ہے بلکہ منزلِ مقصود کے قریب کر دیا ہے۔ یہی وہ پڑاؤ ہے جہاں اُردو افسانوی ادب جست بھر کر فلک بوس ہو گیا ہے بلکہ فن کی معراج پر پہنچ گیا ہے۔ ان اوصاف اور خوبیوں کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ ''اکیس ویں صدی ناول کی صدی'' ہو گی تو یہ بے جا نہ ہو گا۔ کیوں کہ جب ان سترہ برسوں میں اس قدر اچھے ناول سامنے آ گئے ہیں تو ابھی تراسی برس پڑے ہیں۔ نہ جانے ان تراسی برسوں میں کتنے موضوعات، تکنیکیں، افکار و

رجحانات، تصورات و میلانات سامنے آئیں اور سائنسی ترقی زمین سے آسمان تک جا پہنچے تو اُردو کا افسانوی ادب بھی یک سر تبدیل ہو جائے گا۔ یہ ادب اس لیے زندہ رہے گا کہ اس میں تغیرات و تبدیلی کو سمونے کی اہلیت موجود ہے۔ اس طرح اُردو کے افسانوی ادب کا دامن وسعت پذیری کے ساتھ ساتھ گوہرِ آب دار سے مالا مال بھی ہوتا رہے گا۔

اکیس ویں صدی میں تانیثی تحریک نے بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ تانیثی رجحان نے اہلِ قلم خصوصی طور پر افسانہ اور ناول نگاروں کے اذہان پر جو اثرات مرتسم کیے ہیں اس سے بھی اُردو کے افسانوی ادب میں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اب اُردو ادب کا نقاد بھی مرد و عورت کی تحریروں میں تخصیص نہیں کرتا، وہ کسی کی تحریر کو اس بنیاد پر کم زور نہیں کہتا کہ وہ ایک عورت کی لکھی ہوئی ہے اور مردوں کی تحریروں کو اس بنا پر اعلیٰ نہیں گردانتا ہے کہ اس کا لکھنے والا ایک مرد ہے۔ آج کا نقادِ فکشن سے لکھاری کا نام حذف کر کے اپنی رائے دیتا ہے جو غیر جانب دار ہونے کی وجہ سے صائب ہوتی ہے۔ 140 سے زائد جو ناول سامنے آئے ہیں ان میں خواتین ناولوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔

پاکستان کی عمر 70 سال ہو گئی ہے مگر ان ستر برسوں میں پاکستان کے عوام کو کئی حادثات اور سانحات کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلا سانحہ تو تقسیمِ ہندوستان کے وقت پیش آیا جس میں لاکھوں مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ مال و اسباب کو لوٹ لیا گیا اور انسانیت سوز سلوک روا رکھا گیا۔ یہ دور تاریخ میں بدترین کہلاتا ہے۔ عزتوں کی پامالی، قتل و غارت گری، لوٹ کھسوٹ، دھوکا دہی، منافقت اور خون ریزی اس دور کے ابواب رہے ہیں۔ تاریخ ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی جنھوں نے کشت و خون کے اس بازار کو گرم کیا تھا اور اس کی پشت پناہی جن لوگوں نے کی تھی۔ سانحاتِ تقسیمِ ہندوستان کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے اور پاکستان ابھی اپنے قدموں پر ٹھیک طرح کھڑا ابھی نہیں ہو پایا تھا کہ 1958ء کے مارشل لاء کا سامنا کرنا پڑا۔ مارشل لاء کے چنگل سے نکلے تو 1965ء کی جنگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ابھی اس جنگ کا ازالہ نہ ہوا تھا کہ 1971ء کی جنگ مسلط کر دی گئی اور مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا المیہ ہوا۔ یہ صدمہ برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ 1977ء کے مارشل نے آ لیا۔ پھر پاکستان میں طالبان اور دہشت گردوں کا عمل دخل کے واقعات سوہانِ روح تھے۔ ان حقائق سے اہلِ قلم تو کیا کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ

سکتا تھا۔ مصوروں نے ان واقعات کو اپنی تصویروں میں پینٹ کیا، شاعروں نے منظوم اور فکشن نگاروں نے افسانے اور ناول میں اس کا اظہار بڑی شدت سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا اُردو ادب ان سانحات و حادثات کے اظہار سے بھرا پڑا ہے۔

ان حالات میں جب پاکستان دہشت گردی اور طالبان کی شدت پسندی سے بری طرح متاثر تھا، ایسے میں اکیس ویں صدی میں داخل ہونا بے اطمینانی کی کیفیت اور بے سکونی کی حالت میں عجیب سی بات تھی۔ پاکستانی عوام نے نئی صدی کا استقبال تو کیا مگر مایوسی کی فضا میں۔ ایک طرف پوری دنیا نئی صدی کا جشن منا رہی تھی تو دوسری طرف پاکستانی عوام سر بہ سجود تھے اور دعائیں کر رہے تھے کہ یہ صدی ان کے لیے دہشت گردی سے پاک، پُر سکون، آرام و راحت اور اطمینان سے لبریز ہو۔ مگر پاکستان اور پاکستانی عوام کی ایسی قسمت کہاں تھی۔ اس صدی میں بھی ہزاروں مسائل، بیرونی طاقتوں کا دباؤ، شدت پسندی اور قتل و غارت گری، بم بلاسٹنگ عروج پر رہی۔ ایسے میں کوئی طربیہ نغمات کیسے الاپ سکتا تھا۔ سکون کی نیند کیسے سو سکتا تھا، محبت کی بانسری کیسے بجا سکتا تھا۔ جسے کسی پل، کسی کروٹ اور کسی لمحے سکون میسر نہ ہو، وہ اس افراتفری اور نفسانفسی کی کیفیت کا اظہار کیے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ لہٰذا جہاں شاعروں نے مزاحمتی شاعری کی، وہاں افسانہ نگاروں نے مدافعانہ افسانے لکھے اور ناول نگاروں نے اپنے غم و غصے کا اظہار ناولوں میں کیا۔ ایسے حالات میں قلم کاروں کی تحریروں میں مزاحمت سے بڑھ کر جارحانہ پن داخل ہونا فطری عمل تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نئی صدی میں 9/11 کا سانحہ، 2005ء کا دل دہلا دینے والا زلزلہ اور طالبان کے مظالم پاکستانی عوام پر تھوپ دیئے گئے تھے۔ ان مظالم و مسائل سے نہ صرف نظر کیا جا سکتا تھا اور نہ پہلو تہی سے کام لیا جا سکتا تھا اور نہ انہیں نظر انداز کر کے ایک طرف ہٹایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اس مظلوم قوم نے یہ تمام دکھ بہ ذاتِ خود جھیلے، ان تمام سانحات و حادثات کو بیان کرنے میں چند ناول نگار پیش پیش رہے ہیں۔ باقی ناولوں کی فضا اور موضوعات مختلف ہیں۔

اکیس ویں صدی بیس ویں صدی سے یک سر مختلف ہے۔ حالات میں جس قدر تغیرات رونما ہوئے ہیں اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ سماجی، سیاسی، معاشی، اقتصادی، عمرانی اور تہذیبی و ثقافتی کے ساتھ ساتھ ادبی رجحانات بھی تبدیل ہوئے ہیں۔ سیاسی نظام بھی بدل کر رہ گیا ہے۔ اکیس ویں صدی میں ہر میدان میں انقلابی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ یوں سمجھ لیں بیس ویں

صدی میں جو منظر نامہ تھا وہ پورا تبدیل ہو گیا ہے۔ اس میں اندرونی تغیرات ہی نہیں بیرونی طاقتوں نے بھی اپنے عمل دخل سے فضا تبدیل کر دی ہے۔ سائنسی ایجادات اور نت نئی ٹیکنالوجیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تبدیلی کا ایک بڑا ذریعہ سائنس کی ترقی بھی ہے۔ عالمی سطح پر ظلم و ستم، جنگ و جدل، دہشت گردی اور بم دھماکوں کے ساتھ ڈرون حملے بھی چونکاتے ہیں۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر ہمارے معاشرے میں انتشار پھیل کر انسان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ خوف کی فضا ہر گھر میں قائم ہو گئی ہے۔ دہشت نے ہر دل میں ڈیرا ڈال لیا ہے۔ اب دروازے پر معمولی سی آہٹ بھی ہوتی ہے تو دل کانپ جاتا ہے۔ ہوا کے جھونکے کی دستک بھی دل دہلا دیتی ہے۔ یوں خوف اور انتشار نت نئی اشکال میں سامنے آ رہا ہے۔ اس کا اظہار بھی ضروری ہے ورنہ انسان اپنی سوچوں کے بے جا حبس میں سانس نہیں لے سکتا۔ خاموشی، ضبط اور پابندی اسے زندہ رہنے نہیں دے گی۔ ان تمام باتوں اور سماجی تبدیلیوں کے ادب پر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اُردو ادب ان واقعات سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ کیوں کہ ملکِ پاکستان میں سیاست و حکومت اور لسانی تنظیموں کی تبدیلی نے اپنا دائرہ وسیع کیا تو ہر شخص عوام و خواص اس کی زد میں آ گیا۔ اہلِ قلم کی حساسیت نے اس کا اثر گہرائی تک قبول کیا اور اثر کیوں نہ قبول کیا جاتا؟ کاروبار، تعلیم، روزگار، حکومت، سیاست اور سماج کا نیا منظر ترتیب دیا جا چکا تھا۔ خوف، دہشت، ڈر، بے راہ روی، عدم اعتمادی، عدم تحفظ، لوٹ مار، اور قتل و غارت گری نے سب کچھ اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ انتشار اس قدر پھیلا کہ اتحاد و اتفاق کہانیوں کی باتیں نظر آنے لگیں اور تہذیب و ثقافت کا کلچر منتشر ہو گیا۔ اُردو ناول نگاروں نے اپنے تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات اور نازک احساسات کو اکٹھا کیا اور اپنے تمام تر محسوسات کا بیان ناول میں کرنے لگے۔ ان کا مقصد غیر سازگار ماحول کو سازگار بنانا، انتشار کو کم کرنا، مایوسی کی فضا سے باہر نکلنا، خوف اور دہشت کی ہوا کو ختم کرنا تھا۔ اس میدان میں جہاں سینئر ناول نگاروں نے اپنی تحریروں سے اُردو ادب کو وسعت دی وہاں نئے اور تازہ کار ناول نگاروں نے بھی اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا۔ ان کا لب و لہجہ نیا اور موضوعات انوکھے تھے یہی وجہ ہے کہ نئی صدی میں ہمیں ناول نگاری کی صورت میں نئی تحریریں ملیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُردو ناول نگاروں کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ ادب میں کوئی بھی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ہر وقت رد و قبول اور ترمیم و اضافے کی پوری گنجائش رہتی ہے۔ اکیس ویں

صدی میں فکشن نگاروں کی توجہ تیزی سے اُردو ناول کی جانب مبذول ہوئی ہے اور ہمارے سامنے جو ناول آئے ہیں ان ناول لکھنے والوں کی اکثریت افسانہ نگاری میں شہرت رکھتی ہے۔ ان کے ناولوں میں ہر شعبہ جات کا احاطہ کیا جا رہا ہے۔ بچوں کی نفسیات، نوجوانوں کی بے راہ روی، منشیات کا استعمال، وقت کا ضائع کرنا، بے روزگاری، نفسیاتی مریضوں کے احوال، سائنسی ٹیکنالوجی کی مبادیات اور خواتین کے مسائل (آزادیِ نسواں) کو بھی ناول نگاری کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔ نئی صدی میں نئے موضوعات کو برتا جا رہا ہے اور اپنے زمانے کا نوحہ لکھا جا رہا ہے۔ اس منظر نامے نے اُردو ناول کے مطالعے کو فروغ دیا ہے اور قارئین میں دل چسپی پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف نئے ناول لکھے جا رہے اور شائع ہو رہے ہیں بلکہ پڑھے بھی جا رہے ہیں اور ان کا نوٹس بھی لیا جا رہا ہے۔ ان پر بات بھی ہو رہی ہے اور معاشرے میں رفتہ رفتہ ان کے اثرات بھی رونما ہو رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اُردو ناول اور اس کے تنقیدی کام پر شہروں شہروں سیمینار اور ورک شاپس منعقد کریں تا کہ ناول کی قرأت اور اس کی تفہیم زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ اس طرح اُردو ناول کے سفر کا ایک خوب صورت منظر نامہ ہمارے سامنے آتا رہے گا جس سے بحث و مباحثے کے نئے نئے در وا ہوتے رہیں گے۔

آج کے اُردو ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ معاشرے میں ہونے والی ہر تبدیلی کے اثرات بہت جلد قبول کر لیتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیس ویں صدی میں اُردو ناول نگاری کا رجحان کم رہا ہے اور آخری دس سال میں ناول کو زوال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جہاں ناول پڑھنے کا شوق اور اس کی لگن ختم ہو رہی ہے وہاں ناول نگاروں کی دل چسپی میں بھی کمی دیکھی گئی اور بیس ویں صدی کی آخری دہائی میں تو وہ زمانہ گزرا ہے جس نے ناول کے ارتقائی سفر پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ تو خوش گوار حیرت ہے کہ اکیس ویں صدی میں حالات تبدیل ہوئے، معاشرے میں تبدیلی آئی، سائنسی ایجادات نے تغیرات برپا کیے اور نت نئی تہذیبی رویوں میں تبدل ہوا تو نئی نسل کی نئی سوچ نے نیا منظر نامہ مرتب کیا۔

پاکستان میں جہاں زمینی مشکلات فصلوں کی طرح اُگتی ہیں وہاں آسمانی اور ناگہانی آفات نے بھی ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ ان واقعات و سانحات کے متاثرین نے ان عنوانات کے تحت ناول لکھے جو اس عہد کی تاریخ بنتے جا رہے ہیں۔ ان ناولوں میں یکے بعد دیگرے کئی ناول سامنے آئے

جن میں نئے نئے موضوعات کو برتا گیا ہے اور حالاتِ حاضرہ کے ساتھ ساتھ اکنافِ عالم کی بدلتی صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ ان ناولوں کی اثر انگیزی سے ماحول سازگار ہونے کی اُمید پیدا ہوگئی ہے اور حالات میں سدھار متوقع ہے۔ کیوں کہ ان میں حقیقت نگاری نے سچائیوں کو پیش کرنا شروع کر دیا ہے اور سچ وقتی طور پر تو کڑوا لگتا ہے مگر جیت اور بول بالا ہمیشہ سچ کا ہی ہوتا ہے۔ نئے منظر نامے میں ہماری نئی نسل نئے لب و لہجے اور نئے موضوعات لیے ہوئے پیش قدمی کر رہی ہے۔ ان میں کئی ناولوں نے ناول نگاری کو استحکام بخشنے کی ابتدا کر دی ہے۔ پاکستان میں نئی صدی میں اگر ناول نگاری کا یہی انداز رہا تو ناول سے متعلق یہ اعتراض رفع ہو جائے گا کہ ناول اور اس کی تنقید کم لکھی جا رہی ہے۔ نئے ناول میں کئی ناول زمانی اعتبار سے بھی امکانات لیے ہوئے ہیں اور اپنے دور کی عکاسی کر رہے ہیں۔ انہی ناولوں نے نئی صدی کے نئے ناول کی مضبوط اور مستحکم بنیاد فراہم کر دی ہے جس پر عمدہ عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔

آئی ٹی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور فیس بک نئی صدی میں نئی زندگی لے کر آئے ہیں۔ ان سائنسی ایجادات نے اس زمانے میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے جس کے تحت ہر میدان میں بدلاؤ آ رہا ہے۔ گھر گھر میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ لہٰذا جو شخص اس دور کے ساتھ چلے گا وہ زندہ رہے گا اور جو پیچھے رہ گیا وہ زندہ لاش بن کر رہ جائے گا۔ اب اہلِ قلم بھی قلم سے لکھنے کی بجائے انگلیوں کی مدد سے کمپیوٹر پر لکھ رہے ہیں۔ اب ہر میدان، ہر موضوع اور عنوان کے تحت معلومات حاصل کرنے کے لیے کتابوں سے کم اور کمپیوٹر سے زیادہ کام لیا جا رہا ہے۔ فاصلے سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ مہینوں کا کام گھنٹوں اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہونے لگا ہے۔ جہاں ان ایجادات سے فوائد حاصل ہو رہے ہیں وہاں ان کے نقصانات بھی سامنے آ رہے ہیں۔ مطالعے کی عادت کم ہوگئی ہے۔ کتابوں سے محبت ختم ہوگئی ہے۔ ہر شخص کمپیوٹر پر عمر کا زیادہ حصہ گزار رہا ہے، نئی نسل اس کے غلط استعمال سے اپنے آپ کو ضائع کرنے کا سبب بھی بن رہی ہے۔ انسان، انسان نہیں رہا...... ایک مشین کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جہاں وسائل میں اضافہ ہو رہا ہے وہاں مسائل بھی بڑھ رہے ہیں۔ آمدنی میں اضافہ ہوا تو مہنگائی بھی دو چند ہوگئی ہے۔ مسائل جوں کے توں ہیں۔

سیاسی جماعتیں ذات پات، تعصب، گروہی اور نسلی فرقہ واریت اور علاقائی تفریق سے فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ تعصب کے بیج بوئے جا رہے ہیں، نفرت کی فصلیں اُگائی جا رہی ہیں برادری

اور گروپنگ کی بنیاد پر سیاست دان اپنے محل تعمیر کر رہے ہیں، ہر ملّا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔ سماجی اتحاد و اتفاق، قومی یکجہتی، ہم آہنگی اور بھائی چارے کی فضا کو نفرت وحسد اور لالچ کی ہوا دی جارہی ہے۔ فرقہ پرستی اور علاقائیت کا راگ الاپے جارہا ہے۔ معاشرے کی رگ و پے میں نسلی اور زبان کا تعصب سرایت کرگیا ہے مگر پڑھے لکھے افراد ان تمام ناسوروں سے واقف ہوگئے ہیں اور اہلِ قلم نے اپنی جان دار اور بامعانی تحریروں سے معاشرے کو غفلت کی نیند سے بیدار کردیا ہے۔ اس طرح اخلاقی اقدار کے زوال میں بھی کمی آئی ہے اور مسخ کرداروں کا علاج ممکن ہوسکا ہے جو رشتوں ناتوں کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے تھے وہ پُر ہونے لگے ہیں۔ رشتوں کا تقدس بحال ہونے کے امکانات نظر آرہے ہیں۔ پچھلی صدی کی نسبت اس صدی میں کافی سدھار نظر آرہا ہے۔ پاکستان میں اس کی ایک بڑی وجہ عسکری قوتوں اور ان کی مخلصانہ کوششوں کا اثر ہے اور ان کا عمل دخل ہے کہ کافی حد تک لوٹ مار، قتل و غارت گری، جنسی تشدد اور بربریت و وحشت کا بازار ٹھنڈا ہونے لگا ہے۔ خصوصی طور پر پاکستان کے بڑے شہر کراچی میں امن وامان بحال ہو رہا ہے جس سے متاثر ہوکر کراچی کے ایک معروف شاعر لیاقت علی عاصم نے یہ شعر کہا تھا:

خوف آتا ہے اگر میں سوچ لوں کیسے ہوا
وحشتوں کے شہر میں اتنا سکوں کیسے ہوا

سرِ عام خواتین کی عصمتیں تار تار ہونے میں کمی آگئی ہے۔ لیکن عورت کے بارے میں بھی تحفظات محفوظ ہیں، خواتین پر گھریلو جنسی تشدد جاری ہے۔ عورت گھر اور نہ باہر کسی جگہ محفوظ نہیں ہے ہر جگہ اسے جنسی ہراس میں مبتلا کرنا عام معمول بن گیا ہے، عورت اس قدر بے اطمینان اور بے بھروسا ہوگئی ہے کہ اسے اپنے سگے رشتہ داروں پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ کئی حقوقِ نسواں کی تنظیمیں اور خصوصی طور پر حکومتیں اس طرف بھی توجہ دیں۔ کیوں کہ عورتیں بھی اس معاشرے کا حصہ ہیں اور ہمارے شانہ بہ شانہ کام کر رہی ہیں۔ نئے ناول میں بھی ان موضوعات پر قلم اُٹھایا گیا ہے۔ نئی صدی میں جس قدر نئے مسائل کی سوغاتیں ملی ہیں اس سے عہدِ موجود کے مزاج کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ان حالات و واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نئے ناولوں پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ نئی صدی کے سارے مسائل اُردو ناول کے دامن میں سمو دیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو

ناول کا ارتقائی سفر اپنی منزلِ مقصود کی طرف تیزی سے گامزن ہوگیا ہے اور اس کے نئے پن نے قارئین کو چونکا دیا ہے۔ ناول میں کہانیوں کے نہ صرف موضوعات تبدیل ہوئے ہیں بلکہ ناولوں کا انداز بھی تبدیل ہوگیا ہے۔ اس کی ہیئت میں بدلاؤ آیا ہے چاہے وہ معمولی نوعیت کا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی تغیر پذیری نظر آتی ہے۔ اس تبدیلی کو ملاحظہ کرنے کے لیے مستنصر حسین تارڑ، محمد حمید شاہد، علی اکبر ناطق، مرزا اطہر بیگ اور خالدہ حسین کے ناول قابلِ ذکر ہیں۔ محمد حمید شاہد کا ناول آدم مٹی کھاتی ہے اس کی عمدہ مثال ہے۔

نئی صدی میں لکھے جانے والے ناولوں کے اسالیب میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ ان کے بیان اور زبان کی ندرت، اُسلوب کا واضح ثبوت ہے۔ ان ناولوں کا سیاسی، سماجی اور معاشی پس منظر ہمیں نئے پن کی تصویریں دکھاتا ہے۔ ایسا ہونا ہی تھا کیوں کہ ہمارے سماج میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں بلکہ معاشرے کا معاشرہ ہی تبدیل شدہ لگتا ہے لہٰذا ان بدلتے ہوئے اقدار کے ساتھ ناول کے اُسلوب کا بدلنا بھی ضروری ہوگیا تھا۔

اکیس ویں صدی کو Century of IT کہا گیا ہے۔ IT نے میڈیا میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔ میڈیکل، صنعت وحرفت، معاشی اصلاحات، تعلیم کا پروفیشنل ہوجانا، جرائم کے نت نئے طریقے ایجاد ہونا، رنگارنگ سیاست اور دیگر ایسے نئے موضوعات ہیں جو اس نئی صدی میں سامنے آئے ہیں۔ ایک اچھا ادیب اور ناول نگار وہی ہوتا ہے جو اپنے معاشرے پر نظر رکھے، تغیرات وتبدل سے باخبر رہے۔ عالمی سطح پر تبدیل ہوتے منظر نامے سے آگاہ ہو، چند اُردو ناول نگار ہی ایسے ہیں جو اس معیار پر پورے اُترتے ہیں، لہٰذا ایسے ناول نگاروں کے ناولوں کو ہم جدید انداز کے ناول کہیں گے اور وہی ناول عہدِ موجود کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں گے۔ نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ سدابہار موضوعات، پیار و عشق، وفا و جفا، ہجر و وصال، دوستی دشمنی، بھوک پیاس، عزت وذلت، بغض وحسد، عداوت و چاہت اور جدائی و ملن بھی ان ناولوں میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ اکیس ویں صدی میں لکھے جانے والے تمام ناول جدید ہیں یا نئے موضوعات لیے ہوئے ہیں...... ہرگز نہیں۔ بلکہ کچھ ناولوں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان میں نئے موضوعات کے ساتھ اُسلوب بھی جدید اختیار کیا گیا ہے۔ ناول اپنے فارم سے رفتہ رفتہ باہر آتا

Scanned by CamScanner

جار ہا ہے۔ نت نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ یہ تجربات یا تو رد کر دیئے جائیں گے یا پھر ان کو اپنا لیا جائے گا۔ اگر اپنا لیا گیا تو یہ بات خوش آئند ہوگی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ناقدینِ فن کب ان ناولوں کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ میں یہاں فقط اکیس ویں صدی میں لکھے جانے والے (پاکستان کے حوالے سے) ناولوں کی بات کر رہا ہوں۔

اگر اُردو دنیا میں نئے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں کیوں کہ دیکھنے میں تو محسوس ہوتا ہے کہ اکیس ویں صدی کا سفر سترہ برسوں پر محیط ہے مگر منظر نامے کے لحاظ سے یہ ایک بڑے دور پر محیط ہے۔ کیوں کہ یہاں انور سجاد، عبداللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ، بشریٰ رحمٰن، ابدال بیلا، شمیم منظر، رضیہ فصیح احمد، اے خیام، علی اکبر ناطق، مرزا اطہر بیگ اور محمد حمید شاہد کی نمائندگی میں اُردو ناول کا نیا منظر نامہ ترتیب پا رہا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ نئی صدی کے نئے ناول سے اچھی اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ نیا ناول آپ کو کبھی مایوس نہیں کرے گا۔ اس میں بہتری کے امکانات موجود ہیں۔ نئی طرز، نئے موضوعات نیا اُسلوب اور نیا منظر نامہ خوش آئند ہے۔ ان اسالیب کو دیکھتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اُردو ناول رواں صدی میں فن کی معراج حاصل کرے گا۔ بیس ویں صدی کی کمی پوری ہوگی اور مایوسی کی فضا، خوش گواری میں تبدیل ہو جائے گی اور یہ اعتراض بھی ختم ہو جائے گا کہ اُردو ناول کم لکھے جا رہے ہیں۔ اکیس ویں صدی کے ناولوں میں معیار اور مقدار اُمید افزا ہوگا۔

اکیس ویں صدی کے ناول پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو کے ناول نگاروں نے اپنی ناول نگاری سے جہاں اُردو کے فکشن کو مالا مال کیا ہے وہاں اُردو ادب کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر ہمارے یہاں میں بھی ایک مخصوص عرصے کے بعد اُردو ادب کا محاکمہ کرنے کی ریت پڑ جائے تو مزید سنوار اور سدھار آسکتا ہے اور ہمیں فی زمانہ معلومات فراہم ہوتی رہیں گی کہ دنیا میں کیا کیا تغیرات و تبدل رونما ہو چکے ہیں تا کہ ہم بھی اُردو ادب کو ان خطوط پر اُستوار کر سکیں گے۔ یوں اُردو ادب کا معیار روز بہ روز بلند ہوتا چلا جائے گا۔

اکثر ناقدینِ فن، فکشن کے قارئین اور مشاہیرِ اُردو ادب سے یہ جملہ سننے میں آتا ہے کہ اُردو ناول پر بہت کم لکھا گیا ہے اور آج کل تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ لہٰذا میں نے اس طرف توجہ دی اور ناول و ناول نگار کے ساتھ ساتھ ناول کی تنقید کا مطالعہ وسیع کیا تو خوش گوار حیرت ہوئی کہ نہ

تو ناول کم لکھے جا رہے ہیں اور نہ ہی ناول کی تنقید کم لکھی جا رہی ہے۔ پھر نہ جانے کیوں یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ ناول کی تنقید کم لکھی جا رہی ہے۔ میں آگے چل کر اُن ناقدین کے اقتباسات پیش کروں گا جنھوں نے ناول پر جم کر لکھا ہے اور تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔ ناقدین کی شکایت اس معنی میں درست خیال کی جاسکتی ہے کہ ناول کی معیاری اور غیر جانب تنقید کم لکھی جا رہی ہے۔ کراچی کے معروف شاعر و نقاد جناب سرور جاوید نے ایک بار یہ شوشہ اُٹھایا تھا کہ ''ادب رو بہ زوال ہے'' جب ان کے سامنے متعدد فن پاروں کا ذکر کیا گیا تو وہ کہنے لگے کہ میں نے اجتماعی بات کی ہے۔ آج جو اتنا زیادہ ادب لکھا جا رہا ہے اس میں زیادہ تر تحریریں بے کار ہوتی ہیں جن کو ہم ادب کے زمرے میں نہیں لا سکتے اور آٹے میں نمک کے برابر تعداد کو بڑی تعداد پر حاوی نہیں کیا جاسکتا۔ اس بحث کو اگر ناول کی تنقید اور اس بیان کے زمرے میں لیا جائے جس میں کہا گیا ہے کہ ناول کی تنقید کم لکھی جا رہی ہے۔ یعنی اچھی تنقید کم لکھی جا رہی ہے۔ کراچی کے معروف صحافی اور متعدد کتب کے مرتب جناب خرم سہیل کا یہ جملہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ ''موجودہ دور، عہدِ ردی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اہلِ قلم جس طرح کتابیں شایع کروا رہے ہیں ان میں سے اکثریت ردی کی نذر ہو جاتی ہیں، خریدنا تو درکنار...... کوئی انھیں مفت بھی لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔'' خرم سہیل کی اس بات کا مقصد بھی وہی ہے کہ ایسی کتابیں کم شایع ہو رہی ہیں جن کو معیاری ادب کے خانے میں رکھا جاسکتا ہو۔

بہرحال یہاں ہم نے ناول اور اس کی تنقید کے حوالے سے بات کرنا ہے لہٰذا ان ضمن میں عرض ہے کہ اگر پاکستان کے حوالے سے اکیس ویں صدی میں لکھے گئے ناولوں کی فہرست بنائی جائے تو ترتیب کچھ یوں ہوگی:

پاکستان میں اکیس ویں صدی میں شائع ہونے والے اُردو ناول

قربتِ محبت میں مرگ	مستنصر حسین تارڑ	2001ء
دائرہ	محمد عاصم بٹ	2001ء
گھر تو آخر اپنا ہے	وحید عزیز	2001ء
کاغذی گھاٹ	خالدہ حسین	2002ء

حاصلِ گھات	بانو قدسیہ	2003ء
جاگنگ پارک	نکہت حسن	2007ء
زک	نسیم انجم	2007ء
کہر	محمد الیاس	2007ء
تانیہ	وحید عزیز	2007ء
غلام باغ	مرزا اطہر بیگ	2008ء
دھنی بخش کے بیٹے	حسن منظر	2008ء
گہرا زخم	شاعر علی شاعر	2009ء
کراچی والے	محمد امین الدین	2009ء
آشوب گاہ	محمد حامد سراج	2009ء
مٹی کی سانجھ	طاہرہ اقبال	2009ء
خس و خاشاک زمانے	مستنصر حسین تارڑ	2010ء
اندھیرے ہونے سے پہلے	نجمہ سہیل	2010ء
کنجری کا پل	یونس جاوید	2011ء
ماروی اور مرجینا	نجم الحسن رضوی	2011ء
زینو	وحید احمد	2012ء
عجب نصیبی	سید ثروت ضحیٰ	2012ء
سراب منزل	اے خیام	2013ء
یہ عشق نہیں آساں	وحید عزیز	2013ء
گلیوں کے لوگ	اقبال حسن خان	2014ء
پتوار	نسیم انجم	2014ء
آہٹ	نسیم انجم	2015ء
اے جذبۂ دل گر تو چاہے	پروفیسر خیال آفاقی	2015ء
گرداب	سید سعید نقوی	2016ء

یہ راستہ کوئی اور ہے	اقبال حسن خان	2016ء
میرواہ کی راتیں	رفاقتِ حیات	2016ء
نولکھی کوٹھی	علی اکبر ناطق	2016ء
چینی جو میٹھی نہ تھی	صفدر زیدی	2016ء
تلاشِ وجود	اسلم سراج الدین	2016ء
محمد شاہ کا تانگہ	علی اکبر ناطق	2017ء
سر بازار رقصاں	نسیم انجم	2017ء
ڈیوس اور علی بابا	نعیم بیگ	2017ء
نیلی بار	قرۃ العین طاہرہ	2018
انارکلی	مرزا حامد بیگ	2018
چار درویش اور ایک کچھوا	سید کاشف رضا	2018ء
محبت مر نہیں سکتی	وحید عزیز	2018ء
خواب گاہ	شاعر علی شاعر	2018ء

ممکن ہے ان کے علاوہ بھی اور بہت سے اُردو ناول لکھے گئے ہوں مگر یہ ان ناولوں کی فہرست ہے جو نہ صرف منظرِ عام پر آئے بلکہ جن کا نوٹس بھی لیا گیا اور ان پر بات بھی کی گئی۔ ان میں سے اکثر ناولوں کی تنقید بھی لکھی گئی جس سے ان کی تفہیم میں آسانی پیدا ہوئی اور ان کی مزید پرتیں کھولی گئیں جس سے اندازہ ہوا کہ اکیس ویں صدی میں اُردو ناول اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ جلوہ افروز ہوا ہے اور مہرِ منور کی طرح آسمان ادب پر جگمگا رہا ہے۔

◆◆◆

نئی صدی میں اُردو ناول

(ہندوستان کے حوالے سے)

اِس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ہندوستان میں دوقومی نظریات کے حامل افراد کی اکثریت رہتی ہے۔ باقی زبانوں کے افراد ان دونوں سے کم ہیں۔ لہٰذا ان میں شاعروں اور ادیبوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ اکیس ویں صدی میں اگر ہندوستان میں اُردو ناول نگاری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات خوش آیند ہے کہ اِن سترہ برسوں میں اُردو ناول سے اُردو ادب کا دامن مالا مال ہوا ہے۔

ویسے بھی اگر ہندوستان کی تاریخِ اُردو ادب پر نظر ڈالی جائے تو جدید اُردو نثر کا آغاز وہیں سے ہوا۔ 1800 میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اور اس کے پلیٹ فارم سے سرانجام پائے جانے والے ادبی کارہائے نمایاں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے تربیت یافتہ افراد کی نسلیں آج بھی اُردو نثر کے اصناف میں طبع آزمائی کر رہی ہے۔ مگر بیس ویں صدی میں جو کام اُردو ناول نگاری کے زمرے میں آیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے اور اطمینان کا باعث ہے کہ اکیس ویں صدی کے آغاز ہی سے اُردو ناولوں کی تعداد، معیار اور اُردو ناول نگاری کی کاوشیں حوصلہ مند اور اُمید افزا ہونے کے ساتھ ساتھ اطمینان بخش بھی ہیں۔ آج کا نقاد فکشن اور اس کی تنقید سے مایوس نہیں ہے بلکہ وہ اس بڑھتی ہوئی رفتار سے خوش ہے اور خوش گوار حیرت میں مبتلا ہے کہ نئی صدی کے نئے ناولوں میں نئے موضوعات برتے جا رہے ہیں۔ فکشن نگاروں کی دل چسپی اور نئی نسل کے قلم کاروں کا اُردو ناول کی طرف رجحان خوش آیند ہے۔ ہندوستان کے لیے یہ صدی اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں ہندوستان کے ممتاز ناول نگاروں نے اُردو ادب میں گراں قدر ناول پیش کیے ہیں کہ جن کی گونج پاکستان اور اُردو دنیا کی نئی بستیوں کے مکینوں نے بھی سنی ہے۔ جب اکیس ویں

صدی میں لکھے جانے والے ناولوں کا جائزہ لیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ پوری اُردو دنیا میں ایک سو چالیس (140) سے زائد ناول ان سترہ برسوں میں سامنے آئے، جن میں ناولوں کی بڑی تعداد ہندوستان میں شایع ہوئی۔ ان ناولوں سے جہاں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کا منظر نامہ سامنے آتا ہے وہاں اس کے معاشرے کے گوناگوں مسائل اور گرد و پیش کے حالات کی عکاسی بھی نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اکیس ویں صدی کے ان ناولوں میں مندرجہ ذیل ناول شامل ہیں جو ہندوستان میں لکھے گئے:

شیشہ ٹوٹ جائے گا	مقصود الٰہی شیخ	2001ء
پروفیسر ایس کی عجب داستان	مشرف عالم ذوقی	2001ء
عزازیل	یعقوب یاور	2001ء
انیسویں ادھیائے	نند کشور وکرم	2001ء
پکار	مولانا قاسم علوی	2001ء
باول	شفق	2002ء
جنگ جاری ہے	احمد صغیر	2002ء
مجھ سے کہا ہوتا	آنند لہر	2002ء
گوتم	بلراج ورما	2002ء
میرے نالوں کی گم شدہ آواز	محمد علیم	2002ء
غمِ دل وحشتِ دل	محمد حسن	2003ء
مہاماری	شموئل احمد	2003ء
کابوس	شفق	2003ء
دی وار جرنلس	صلاح الدین پرویز	2003ء
چار رنگ کی کشتی	صدیق عالم	2003ء
اگر تم لوٹ آتے	آچاریہ شوکت خلیل	2003ء
ویرگاتھا	سلیم شہزاد	2003ء
تو اور میں	عباس خاں	2003ء

وشواس گھات	جتیندر بلو	2003ء
پار پرے	جوگندر پال	2004ء
اگنی پریکشا	کشمیری لال ذاکر	2004ء
دھمک	عبدالصمد	2004ء
پو کے مان کی دنیا	مشرف عالم ذوقی	2004ء
فسوں	غضنفر	2004ء
وش منتھن	غضنفر	2004ء
مورتی	ترنم ریاض	2004ء
نخلستان کی تلاش	رحمان عباس	2004ء
اندھیرا پگ	ثروت خان	2005ء
آہنکار	نورالحسنین	2005ء
جب گاؤں جاگے	شبر امام	2005ء
میں اور امراؤ جان	عباس خان	2005ء
شہر میں سمندر	شاہد اختر	2005ء
جیون مایا	فارینہ الماس	2005ء
کئی چاند تھے سرِ آسماں	شمس الرحمٰن فاروقی	2005ء
ایک ہزار دوراتیں	صلاح الدین پرویز	2006ء
دروازہ ابھی بند ہے	احمد صغیر	2006ء
رانگ نمبر	مشتاق انجم	2006ء
صدرِ محترم	اشرف شاد	2006ء
خوابوں کی بیساکھیاں	انل ٹھکر	2007ء
جسے میر کہتے ہیں صاحبو!	حبیب حق	2007ء
شوفر	ظفر عدیم	2007ء
شوراب	غضنفر	2008ء

ندی	شموئل احمد	2008ء
سڑک سیدھی جاتی ہے	ظفر عدیم	2008ء
یاسمین	ظفر عدیم	2008ء
کہانی کوئی سناؤ متاشا	صادقہ نواب سحر	2008ء
برف آشنا پرندے	ترنم ریاض	2009ء
ایک ممنوعہ محبت کی کہانی	رحمان عباس	2009ء
جانے کتنے موڑ	آشا پربھات	2009ء
ایک اور کوسی	نسرین ترنم	2009ء
چمن کو چلیے	عبیدہ سمیع الزماں	2009ء
بکھرے اوراق	عبدالصمد	2010ء
پلیتہ	پیغام آفاقی	2010ء
سانپ اور سیڑھیاں	سلیم شہزاد	2010ء
سیاہ کاریڈور میں ایلین	جاوید حسن	2010ء
اوٹرم لین	خوشنودہ نیلوفر	2010ء
نرآکار	عمر فرحت	2010ء
چاند کی کہانی	قمر نقشبند نقوی	2010ء
ہند ایک خواب اور	وسیع بستوی	2010ء
مانجھی	غضنفر	2011ء
لے سانس بھی آہستہ	مشرف عالم ذوقی	2011ء
موت کی کتاب	خالد جاوید	2011ء
خدا کے سائے میں آنکھ مچولی	رحمان عباس	2011ء
زخم	محمد عمر فاروقی	2011ء
قرطبہ	مصطفیٰ کریم	2011ء
رشتے	انل ٹھکر	2012ء

نام دیو	آنند لہر	2012ء
فٹ پاتھ کی زبانی	حبیب کیفی	2012ء
لیپا	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2012ء
سسما	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2012ء
در کتے رشتے	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2012ء
لمحوں کی کسک	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2012ء
گلابی پسینہ	نفیس تیاگی	2012ء
راجپوت	عبداللہ بیگ	2012ء
شکست کی آواز	عبدالصمد	2013ء
آتشِ رفتہ کا سراغ	مشرف عالم ذوقی	2013ء
نادیدہ بہاروں کے نشاں	شائستہ فاخری	2013ء
ایک بوندا جالا	احمد صغیر	2013ء
لیمی نیڈ گرل	احمد صغیر	2013ء
انگوٹھا	ایم مبین	2013ء
ایوانوں کے خوابیدہ چراغ	نورالحسنین	2013ء
زوالِ آدم خاکی	محمد غیاث الدین	2013ء
دوسری ہجرت	سرور غزالی	2013ء
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	نشاط پیکر	2013ء
نالۂ شب گیر	مشرف عالم ذوقی	2014ء
گم شدہ شناخت	انل ٹھکر	2014ء
نعمت خانہ	خالد جاوید	2014ء
صدائے عندلیب بر شاخِ شب	شائستہ فاخری	2014ء
اوڑھنی	نصرت شمسی	2014ء
اے دلِ آوارہ	شموئل احمد	2015ء

چاند ہم سے باتیں کرتا ہے	نورالحسنین	2015ء
گئو دان کے بعد	علی ضامن	2015ء
موت کا سوداگر	شاہ جہاں جعفری حجاب	2015ء
آخری سواریاں	سیّد محمد اشرف	2015ء
گرداب	شموئل احمد	2015ء
جن دن سے	صادقہ نواب سحر	2016ء
چاند کی سحر	ڈاکٹر شہناز فاطمی	2016ء
روحزن	رحمان عباس	2016ء
نمائش خانہ	اسد رضا	2016ء
تیلیما	شفق سوپوری	2016ء
رنگ محل	طاہر اسلم گورا	2016ء
لفظوں کا لہو	سلمان عبدالصمد	2016ء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ناولوں کے ناقدین کی آرا پیش کی جائیں تاکہ اُردو ناول کا سفر اور اکیسویں صدی تک اس کے ارتقائی مراحل سے آگاہی ہو سکے:

نوٹ:

شہر کولکاتا کے تاریخی ادارے دی مسلم انسٹی ٹیوٹ کی ایجوکیشن سب کمیٹی کی جانب سے ''اکیسویں صدی میں اُردو ناول'' کے عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کی تجویز پیش کی گئی جسے ادارے کی مجلسِ انتظامیہ نے منظور کر لیا اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی کے مالی اشتراک سے یہ سیمینار 2 روزہ منعقد ہوا، جس میں ریاست و بیرونِ ریاست سے فکشن پر گہری نظر رکھنے والے قلم کاروں نے شرکت کی اور پُر مغز مقالے پیش کیے۔ اقتباسات اس سیمینار میں پڑھے گئے مقالات سے اخذ کیے گئے ہیں۔
سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کلیدی خطبہ میں معروف فکشن نگار سیّد محمد اشرف نے اُردو ناول کے ارتقائی مراحل سے پُر مغز گفتگو کرتے ہوئے کہا:

''اُردو ناول کا سفر جو ''مراۃ العروس'' سے شروع ہوا تھا، انیس ویں صدی سے بیس ویں اور پھر اکیس ویں صدی میں آج ڈیڑھ صدی کی مسافت طے کر چکا ہے۔ اس دور میں ہم نے کئی کام یاب بلکہ شاہ کار اُردو ناول دیکھے جن پر وقت کی گرد کبھی نہیں جمی اور آج بھی ان کی چمک دمک بہ دستور قائم ہے۔ اُردو ناول کا یہ سفر ہنوز جاری ہے۔ اُردو ناول نگاروں نے ہر دور میں وقت کی تقاضی کرتے ہوئے جہاں سماج اور معاشرے کے رِستے ناسوروں کو اپنے ناولوں میں جگہ دی، وہیں مثبت پہلوؤں کو بھی نمایاں انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول کے فن کے لیے لازمی ہے کہ ناول نگار میں عصری بصیرت کے ساتھ اپنی تاریخ کی وسیع تر آگہی بھی ہو، دنیا کے بسیط مشاہدے کے ساتھ نثری اور شعری کلاسیک سے واقفیت بھی۔ مجھے خوشی ہے کہ اُردو کے معاصر ناول نگاروں میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔''

مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی جنرل سکریٹری شیخ شمشیر عالم (آئی آر ایس) نے حاضرینِ سیمینار اور بیرونی مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا:

''بنگال کو جدید اُردو نثر کے آغاز کی سرزمین ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اب تک مغربی بنگال کے قلم کاروں نے اُردو نثر کی ہر صنف میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ بیس ویں صدی میں یہاں بھی خوب ناول لکھے گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ صدی میں اس کی رفتار یہاں کچھ سست پڑ گئی ہے۔ اس سیمینار کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مغربی بنگال میں لکھے گئے ناولوں پر بھی مفصل گفتگو ہو۔''

ادارۂ ہٰذا کے صدر حیدر عزیز صفوی نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''مغربی بنگال میں اُردو کا مستقبل روشن ہے جس کا بین ثبوت آج کا یہ سیمینار ہے۔''

سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی اور اپنے صدارتی خطبہ میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اراکین کی اس کوشش کی ستائش کرتے ہوئے کہا:

''اکیس ویں صدی میں اُردو ناول کے حوالے سے منعقد ہونے والا یہ سیمینار ہر اعتبار سے کام یاب ہے۔ آج کے اجلاس میں جو مقالے پیش کیے گئے ان سے اُردو ناول کے سفر کا ایک خوب صورت منظر نامہ ہمارے سامنے آیا جس نے بحث و تمحیص کے نئے در بھی وا کیے۔

مجھے یقین ہے کہ اکیس ویں صدی میں اُردو ناول کے حوالے سے جب بھی کچھ لکھا جائے گا تو اس سیمینار اور سیمینار میں پیش کیے گئے مقالوں کا حوالہ ضرور دیا جائے گا۔''

سیمینار کا دوسرا اجلاس ڈاکٹر امام اعظم کی صدارت میں ہوا۔ موصوف نے اجلاس کے دوران پیش کیے گئے مقالوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے صدارتی خطبے میں کہا:

''اُردو میں ناول نگاری کا رجحان نئے سرے سے فروغ پا رہا ہے۔ گزشتہ پندرہ برسوں کے دوران صرف صوبۂ بہار میں ہی 30 ناول لکھے جا چکے ہیں، جس کی بنا پر بہار کو اُردو ناول کی راجدھانی کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اُمید قوی ہے کہ بہار کے ناول نگاروں کی تقلید میں دیگر مراکزِ اُردو میں بھی ناول نگاری کی طرف ہمارے قلم کار توجہ دیں گے۔ سیمینار میں پڑھے ہوئے مقالوں کے ساتھ ہمارے قلم کاروں نے بھرپور انصاف کرتے ہوئے ہندو پاک میں لکھے جانے والے ناولوں پر مدلل گفتگو کی۔''

سیمینار کا تیسرا اجلاس ڈاکٹر زین رامش کی صدارت میں ہوا۔ موصوف نے اس اجلاس میں پڑھے گئے مقالوں کا سیر حاصل جائزہ لیتے ہوئے کہا:

''اس اجلاس میں پیش کیے گئے تمام مقالے پیش کش اور مواد کے اعتبار سے بھرپور کام یاب رہے۔ حاضرین نے پڑھے گئے مقالوں پر جم کر سوال بھی کیے جن کے فاضل مقالہ نگاروں نے برمحل اور تشفی بخش جواب بھی دیے جو کہ سیمینار کی من جملہ کام یابی کا ثبوت ہے کہ حاضرین مقالوں کی پیش کش کے دوران مقالہ نگاروں کے ساتھ رہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ ناول کے فارمیٹ اور ہیئت پر بحث کی جا رہی ہے۔ ادب میں کوئی بھی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ردّ و قبول کی پوری گنجائش رہتی ہے۔''

معروف افسانہ نگار انیس رفیع نے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''موجودہ صدی اُردو ادب میں ناولوں کی صدی قرار دی جائے گی کیوں کہ ابتدائی پندرہ برسوں میں ہی پچاس سے زائد ناول صرف ہندوستان کی سرزمین پر قلم بند کیے جا چکے ہیں۔ فکشن نگاروں کا رجحان تیزی سے ناول نگاری کی جانب مبذول ہو رہا ہے اور ہر شعبہ ہائے حیات کا احاطہ اُردو ناولوں میں کیا جا رہا ہے۔ بچوں کی نفسیات، ٹیکنالوجی کی مبادیات اور نوجوانوں کے مسائل آج کے اُردو ناولوں کے خاص موضوعات ہیں۔''

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اُردو فکشن کے حوالے سے ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ فکشن کی تنقید کے علاوہ ان کے افسانے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اُردو سے وابستگی کے بعد انھوں نے اسے حیاتِ نو عطا کی ہے۔ ریاستی، قومی اور بین الاقوامی سیمناروں کا اہتمام سلیقے سے کرانے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے ''نئی صدی، نیا ناول: صورتِ حال اور امکانات'' پر بھر پور روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خاص انداز میں کہا:

''نئی صدی کے ناول کا منظر نامہ بہ ظاہر ضرور 15-14 برسوں پر محیط ہے لیکن پس منظر اور منظر خاصے وسیع علاقے اور زمانے کا احاطہ کرتے ہیں۔ اگر صرف اکیس ویں صدی کے اہم ناولوں کا ہی مطالعہ کیا جائے تو کئی ہزار صفحات بھی کم پڑیں گے۔ پاکستان کا منظر نامہ الگ ہے۔ وہاں انتظار حسین، انور سجاد، عبد اللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ، بشریٰ رحمٰن، ابدال بیلا، شیم منظر، رضیہ فصیح احمد وغیرہ کی نمائندگی میں ایک وسیع منظر نامہ ترتیب پا رہا ہے۔ پھر اکیس ویں صدی میں ہمارے کئی بزرگ ناول نگار جوگندر پال، ساجدہ زیدی، اقبال مجید، رتن سنگھ سے لے کر نشاط بیکر اور قمر نقوی بھوپالی، نفیس تیاگی وغیرہ کے ناولوں کے مطالعے کے لیے الگ سے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں اکیس ویں صدی کے چند اہم اور سامنے کے ناولوں کا ہی احاطہ ہو پایا ہے۔ بہر حال یہ بات تو مستحکم طور پر کہی جا سکتی ہے کہ نئی صدی کا نیا ناول اُمید افزا ہے۔ مایوسی کی کوئی صورت نہیں۔ امکانات صحت مند ہیں۔ نئی طرز، نئے موضوعات، نیا اُسلوب اور نیا منظر نامہ کہیں کہیں فن کاری سے ایسا روپ لے رہا ہے جو اُردو ناول کے لیے نیک فال ہیں۔''

ڈاکٹر زین رامش کا تعلق سہسرام، بہار کے ایک علمی خانوادے سے ہے۔ موصوف فی الحال ونوبا بھاوے یونیورسٹی (ہزار باغ، جھارکھنڈ) میں شعبۂ اُردو میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات پر مامور ہیں۔ شاعری، نثر نگاری، تنقید، تحقیق، تصوف اور ریڈیائی فیچر لکھنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ قومی و بین الاقوامی سیمناروں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ ملک کے معتبر رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اب تک آٹھ کتابیں منظرِ عام پر آ کر قبولیت کا شرف حاصل کر چکی ہیں۔ تنقیدی نظر رکھتے ہیں اور اپنے دل کش انداز میں دلائل سے

قارئین اور سامعین کو قائل کر لیتے ہیں۔ موصوف نے اپنے مقالے ''اکیس ویں صدی میں جھارکھنڈ میں اُردو ناول'' میں جھارکھنڈ کے ناول نگاروں اور وہاں ناول کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''جہاں تک اکیس ویں صدی میں قیام جھارکھنڈ کے بعد یہاں اُردو ناول کی تخلیق کا معاملہ ہے یہ معاملہ حیرت ناک حد تک مایوس کن ہے۔ دیگر کسی بھی اصنافِ ادب، اُردو کے مقابلے میں ناول نگاری کے تعلق سے اس قدر بے توجہی اور منفی رویہ کیوں رہا، آپ کو یہ جان کر انتہائی حیرت ہوگی جو مجھے بھی ہے کہ اکیس ویں صدی یا قیام جھارکھنڈ کے گزشتہ پندرہ سالوں میں صرف دو ناول ہی شائع ہو سکے اور یہ دونوں ہی ناول 2013ء میں منظرِ عام پر آئے، ایک 2013ء کے اوائل میں اور ایک اواخر میں۔ جب کہ دیگر اصنافِ ادب کے تعلق سے اس قدر مایوس کن صورتِ حال نہیں رہی۔ قابلِ لحاظ تعداد میں افسانوی مجموعے بھی شائع ہوئے اور شعری مجموعے بھی۔''

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی بہار کے ادبی اُفق سے اُبھرنے والے اُردو فکشن کی تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین قومی بین الاقوامی رسائل و جرائد میں پابندی سے شائع ہوتے رہتے ہیں اور اہلِ علم و ادب ان کی تحریروں کو ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ موصوف نے شعبۂ اُردو، پٹنہ یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ ہونے کے بعد شعبہ کو اُردو ادب کے منظر نامہ پر ایک نئی شناخت عطا کی ہے۔ ان کی رہ نمائی میں شعبہ میں نہ صرف قومی سیمناروں کا اہتمام کیا جا رہا ہے بلکہ اُردو جرنل کے نام سے ایک وقیع تحقیقی جریدہ بھی گزشتہ چھ برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ جس کی ترویج و اشاعت بھی ان ہی کے ذمے ہے۔ موصوف قومی بین الاقوامی سیمناروں میں بھی شرکت کرتے رہتے ہیں۔ یوں تو تنقید و تحقیق سے انہیں گہرا ربط ہے لیکن اُردو فکشن اور اس کی تکنیک و ہیئت ان کا خاص میدان ہے۔ ان کی اب تک چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اپنے مقالے ''اکیس ویں صدی میں اُردو ناول: ایک تنقیدی مطالعہ'' میں انھوں نے لکھا:

''اکیس ویں صدی میں ہندوستان کا اُردو ادب مجموعی طور پر ناول کی طرف زیادہ سنجیدگی سے متوجہ ہوا ہے۔ ہمارے ناول نگاروں نے اکیس ویں صدی کی موجودہ زندگی کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ شاید ہی عوام و خواص کی زندگی کی کوئی صورت ان کی گرفت اور

اظہاریت سے چھوٹی ہو۔ آج کی رنگارنگ زندگی، معاشرے پر مغربی دباؤ اور اثرات، معاشی صورتیں، نفسیاتی پیچیدگیاں، جنسی اور سیکسی رویے، سیاست کے داؤ پیچ، استحصال کے نئے نئے روپ اور ہر پل نئے تجربات سے دوچار ہوتا سماج بیان کے کھلے اور ڈھکے چھپے دونوں طریقے سے ان ناولوں میں موجود ہے۔ طریق کار کے پرانے فریم ورک ٹوٹ چکے ہیں اور ناول نگار پیچیدہ کیفیات پیش کرنے کے لیے الفاظ اور زبان کے سراب آمیز میدانوں سے گزر رہے ہیں۔ ان کے بیانیہ میں واقعے کی صرف اوپری سطح اہم نہیں واقعے کے اندرون میں برپا تلاطم، کرداروں کی زندگی اور کارکردگی میں ہلچل اور کشمکش اور ان پر گزرتی ہوئی لمحاتی اور دوررس کسک چھپی ہوئی ہے جس کے محاسبے اور واقعیت کے بغیر نئی تنقید ان کی روح تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس صدی میں اُردو ناول کی سمت و رفتار آگے چل کر کیا ہوگی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا مگر ایک بات ہمیں مطمئن کرتی ہے کہ اکیس ویں صدی کا یہ پندرہ سالہ عرصہ ناول کی تخلیق کے لحاظ سے اتنا بھرپور رہا ہے کہ ہم تہی دامنی کی شکایت نہیں کر سکتے۔''

احمد سہیل کراچی، پاکستان کے معروف شاعر، ادیب، محقق اور تنقید نگار ہیں۔ عرصہ دراز سے امریکا میں مقیم ہیں۔ جہاں اُردو زبان و ادب کے فروغ میں حصہ لے رہے ہیں۔ اُردو کے ادبی منظرنامہ میں ادبی نظریہ سازی اور تنقیدی حوالوں سے موصوف کا نام اہم مانا جاتا ہے۔ جدید تھیٹر، ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید، تنقیدی تحریریں ان کی اہم تصانیف ہیں۔ امریکا کی جدید نیگرو اور لاطینی امریکی ادب کے اُردو تراجم کے حوالے سے ان کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ 1991ء میں انہیں کیلی فورنیا، امریکا میں ورلڈ آف پوئٹری کی جانب سے ''گولڈن پوئٹ'' کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ موصوف کے تنقیدی و تحقیق مضامین قومی بین الاقوامی رسائل و جرائد میں پابندی سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ امریکا میں مقیم پاکستانی ناول نگار صفدر زیدی کے مشہور ناول ''چینی جو میٹھی نہ تھی'' کے حوالے سے موصوف رقم طراز ہیں:

''صفدر زیدی کا ناول ''چینی جو میٹھی نہ تھی'' نوآبادیاتی جبر کے تاریخی تناظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ناول پس کربیہ یا ناسٹلجیائی کیفیت اور نقل مکانی کے المیات کو فن کارانہ سیاق و انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں ثقافتی اور تہذیبی معاملات کا بشری اور انسانی تاریخ میں پنڈولم کی طرح ڈولتا ہوا فرد سامراج یا نوآبادیات کے کثیر الملکی جبر سے دوچار ہے،

جس کا کل آج پر بھاری ہے۔

اس ناول میں نقل مکانی اور ہجرت کے فرق کو بھی اُبھارا گیا ہے مگر یہ دونوں تصور ایک دوسرے میں اس قدر گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ یہ طے نہیں ہو پایا کہ یہ نقل مکانی تھی یا اس کو ہجرت کہا جائے کیوں کہ اس ناول میں افراد ان پرندوں کی طرح ہیں جو بہترین زندگی اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ہزاروں میل کا سفر کر کے دوسرے خطوں کے درختوں پر گھونسلا بنا لیتے ہیں۔ اس ناول کو تاریخی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے طور پر تاریخی تو ہے مگر اس کو مکمل طور پر تاریخی نہیں بلکہ فکشن کی تاریخ سازی کے نئے تصور اور اصطلاح سے زیادہ قریب سمجھا جا سکتا ہے جس کا بیانیہ محض داستانی نہیں بلکہ ایک فکری اور تہذیبی بھی ہے۔''

مغربی بنگال کے ادبی اُفق پر ڈاکٹر دبیر احمد کا نام تحقیق و تنقید کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ آپ دس کتابوں کے مرتب و مؤلف ہیں۔ شہر کولکاتا کی تاریخی درس گاہ مولانا آزاد کالج میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں۔ ریاستی و قومی سطح پر منعقد ہونے والے سیمیناروں میں اکثر شرکت کرتے ہیں۔ سیمینار میں پیش کیے گئے اپنے مقالے ''اکیس ویں صدی کے اہم ناول نگار'' میں معروف ناول نگاروں کے فن پر تجزیاتی انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''اکیس ویں صدی میں بعض ناول نگاروں نے ناول کے دامن کو وسعت و تنوع عطا کرنے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ ان میں جوگندر پال، عبدالصمد، غضنفر، مشرف عالم ذوقی اور شمس الرحمٰن فاروقی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ناول زندگی کی ایسی تصویر ہے جس میں عام زندگی کے مسائل، خوشی اور غم اس طرح پیش کیے جاتے ہیں کہ تصویریں صاف نظر آ جاتی ہیں۔ یہ ناول نگار کی فکر پر منحصر ہے کہ وہ اس تصویر کو اس قابل بنائے کہ وہ حقیقت سے قریب تر نظر آئے۔''

مقصود دانش کا نام فکشن کی تنقید کے حوالے سے کام کرنے والے قلم کاروں کی فہرست میں اپنی شناخت رکھتا ہے۔ طویل عرصے سے موصوف کا تخلیقی و تنقیدی سفر نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ ان کے مضامین ملک کے معیاری رسائل میں تواتر کے ساتھ شائع ہو کر اہلِ نظر کو اپنی جانب متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ موصوف نے اپنے مقالے ''اکیس ویں صدی کے ناولوں میں معاشرتی پس منظر'' کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا:

''کائناتِ اکبر کو خدا نے تخلیق کیا، ناول نگار کائناتِ اصغر کی تخلیق کرنے پر اصرار

کرتا ہے۔ کائناتِ اصغر میں ہر سو کیے جا رہے تماشوں کا ناول نگار محض تماش بین نہیں بلکہ ترجمان ہوتا ہے۔ ناول کو زمان و مکاں کی گرفت سے آزاد نہیں کیا جا سکتا لیکن زمان و مکاں سے متعلق واردات وسانحات کا صحافتی بیان آرٹ نہیں۔ آرٹ کے نمود کے لیے ضروری ہے کہ افکار و خیالات، واقعات وسانحات، انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں، جنگ و جدل کے منظر ناموں قدرتی آفات کی تباہ کاریوں اور معاشرتی انتشار کی عکاسی تخلیقی زبان میں کی جائے۔ ناول نگاری اب روز و شب کا قصہ ٹھہری۔ کبھی برسوں میں ایک آدھ ناول کا ذکر چھڑتا اور ہفتوں تبادلۂ خیال کیا جاتا۔ اب ہر صبح ایک نئے ناول کی آمد کی اطلاع دی جاتی ہے۔ بعض ناول وجود میں آتے ہی اذان سننے کی بجائے غسال کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ بعض کا جسم نہ صرف لاغر ہوتا ہے بلکہ تپ دق کا مریض نظر آتا ہے۔ ناول کے زیادہ تر اوراق پر شہید بابری مسجد کے خون کے چھینٹے نظر آتے ہیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد ناول کو لہولہان کرنے کی بجائے مشتعل اذہان کو مرتب و منظم کرنے کی فن کارانہ سعی کی گئی۔''

رحمان عباس معاصر اُردو فکشن کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔ ہندوستان میں اُردو ناول نگاری کے ارتقا و فروغ میں ان کی خدمات لائقِ ستائش ہیں۔ ''نخلستان کی تلاش'' ان کا پہلا ناول ہے جس سے اُردو ناول کے منظر نامہ پر ان کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' ان کا دوسرا ناول ہے جس پر سوسائٹی فار پیس اینڈ ریسرچ (اورنگ آباد) نے انہیں نیشنل ایوارڈ برائے ادب سے نوازا۔ ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' ان کا تیسرا ناول ہے جس پر مہاراشٹر اُردو ساہتیہ اکادمی نے فکشن کی بہترین کتاب کے انعام سے نوازا اور جسے موصوف نے 2015ء میں دہلی سے قریب داوری میں محمد اخلاق کے بہیمانہ قتل پر مرکزی و ریاستی حکومتوں کے سرد رویہ کے خلاف احتجاجاً واپس کر دیا۔ ''روحزن'' ان کا چوتھا ناول ہے۔ اس کے علاوہ ''اکیس ویں صدی میں اردو ناول اور دیگر مضامین'' کے عنوان سے ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ موصوف نے اپنے مقالہ ''اکیس ویں صدی میں اُردو ناول'' میں کہا:

> ''نئی صدی کی ابتدا سے تا حال جو ناول شائع ہوئے ہیں ان میں سے بیش تر کو پڑھ کر میں مطمئن نہیں ہوں کیوں کہ یہ ناول حسن، معنویت اور ندرت سے اس قدر محروم ہیں کہ ان میں نہ کوئی کسی جہانِ دیگر کی سیر کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کے مطالعہ سے نئی روشنی ملتی

> ہے۔ فرانز کافکا کا کہنا تھا کہ A book must be the axe for the frozen sea inside us. جب کہ یہ ایسی کتابیں ہیں جو اندر کی برف کو توڑنے کی بجائے اس احساس میں گرفتار کرتی ہیں کہ ہمارے ناول نگار آرٹ کے تقاضوں کا پاس نہیں رکھتے اور اس تخلیقی قوت سے محروم ہیں جو ناول کے گلستان میں ہزار رنگ بھر دیتی ہے۔ تخلیقی قوت کی کمی کے سبب یہ فن کار ناولوں میں الفاظ کا ڈھیر جمع کرتے ہیں جس میں ڈوبنا سیراب نہیں کرتا بلکہ جسم و جاں کو مزید منجمد کر دیتا ہے۔''

ڈاکٹر عمر غزالی مغربی بنگال کے موجودہ ادبی منظر نامے کا ایک معروف نام ہے۔ موصوف ہگلی کی تاریخی درس گاہ ہگلی محسن کالج کے شعبۂ اُردو میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی نگرانی میں چار طلبا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ موصوف خود بارہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تخلیقات تواتر سے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اکیس ویں صدی کے معروف اور بے باک ناول نگار رحمان عباس کے فن پر اپنے مقالے ''رحمان عباس کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ'' میں فرماتے ہیں:

> ''اکیس ویں صدی ابھی نئی صدی ہے اور رحمان عباس بھی بالکل نئے لکھنے والے ہیں۔ بہ حیثیت ناول نگار ان کا ادبی سفر 2004ء سے شروع ہو چکا ہے اور اب تک وہ کئی ناولوں کے مصنف ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''نخلستان کی تلاش'' (2004ء)، دوسرا ناول ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' (2009ء) اور تیسرا ناول ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' (2011ء) زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ رحمان عباس کا ناول ''نخلستان کی تلاش'' (2004ء) ابتدائی شعوری فکر کا نتیجہ ہے اور مقدمہ دائر کرنا دنیاوی فکر کا۔ اس مختصر سے جملے کا استعمال اس لیے کیا گیا ہے کہ مصنف نے جس فکر کے تحت اپنے ناول میں موضوعات اخذ کیے ہیں اور بعد میں کچھ مناظر قلم بند کیے وہ ان کی فکر، ان کی عمر اور واقعات و کردار کے تحت وجود میں آئے ہیں لیکن ایک عام قاری ان تمام معاملات کو کس نہج سے پرکھتا ہے یہ اس پر منحصر ہے۔''

معید رشیدی مغربی بنگال کے مردم خیز علاقے کانکی نارہ سے اُردو ادب کے منظر نامے پر طلوع ہونے والا وہ باصلاحیت فن کار ہے جس نے اپنی صلاحیتوں کا اعتراف اب ایک عالم سے

کرالیا ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی معید کے جوہر سامنے آنے لگے تھے اور جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دے رہا ہے، معید نے پہلی بار مسلم انسٹی ٹیوٹ کی لٹریری سب کمیٹی کی جانب سے پروفیسر اعزاز افضل کی حیات وخدمات پر منعقد ہونے والے سیمینار میں مقالہ پڑھا تھا اور ان کے نثری اُسلوب اور خوب صورت اندازِ ادائیگی سے محفل عش عش کر اٹھی تھی۔ آج معید ایک خوش فکر شاعر اور منفرد ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں۔ فی الحال علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ معید رشیدی کی چار کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ انھیں ساہتیہ اکادمی نے نوجوان ادیب کے ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔ ہندوپاک کے معروف رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ معید رشیدی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے مشہور ناول کے حوالے سے اپنا مقالہ بعنوان ''کئی چاند تھے سرِ آسماں: چند باتیں حالیہ تناظر میں'' پڑھا اور اس ناول کی اہمیت پر مختلف حوالوں سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''کئی چاند تھے سرِ آسماں' کا متن اگر ناول نہیں تو کیا ہے؟ اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ اگر کم زور ناول ہے تو اس کے لیے دلائل کا فقدان ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کہ تاریخ کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس کے بیانیہ میں تاریخی کتب اور قدیم لغات سے استفادہ کیا گیا ہے، اس لیے فرسودہ اور بے کار ہے، قطعی مناسب نہیں۔ اسی بات کو اگر تعریف کے پیرایے میں کہا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ فاروقی صاحب نے انیس ویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب کو اس کی پوری گہرائی، لطافت اور طاقت کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ اس لیے یہ تاریخ نہیں ماضی کی بازیافت ہے۔ یہ تاریخ نہیں تہذیبی مرقع ہے۔ اگر تاریخ پر اصرار ہی مقصود ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول تاریخ کی ازسرِ نو تخلیق ہے۔''

ڈاکٹر شارقہ شفتین کا تعلق مغربی بنگال سے رہا ہے۔ موصوفہ کلکتہ گرلز کالج کی سابق طالبہ رہی ہیں۔ بعد میں وہ پٹنہ منتقل ہوگئیں اور وہاں مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں داخلہ لیا اور وہاں سے ''اُردو ناول میں خواتین کے سماجی مسائل کی عکاسی'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ان دنوں محترمہ پٹنہ کے سینٹ زیویرس اسکول میں اُردو کی تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے علاوہ ان کے تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ''مطالعہ کی میز پر'' منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اپنے مقالے ''ڈاکٹر شہناز فاطمی کی ناول

نگاری'' میں ناول کے نسوانی کرداروں کا خوب صورتی سے احاطہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''2016ء میں منظرِ عام پر آنے والا شہناز فاطمی کا ناول ''چاند کی سحر'' بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کام یاب رہا۔ یہ ناول پچھلے کئی بڑے بڑے ناول نگاروں کے ناولوں کی یاد دلا جاتا ہے۔ یہ ناول بھی سماجی واصلاحی ناول ہے اس کا تانا بانا دو بہنوں کے گرد بنا گیا ہے۔ چاند اور سحر یہ دونوں ہم عمر بہنیں ہیں لیکن قدرت نے بالکل مختلف رنگ ونقوش دیے۔ چاند، چاند کی طرح خوب صورت تھی اور سحر معمول صورت والی لڑکی تھی لیکن قدرت کا انصاف اللہ نے اسے پڑھنے لکھنے اور ہنرمندی کی توفیق عطا کی تھی اس ناول میں مصنفہ نے تعلیم کی اہمیت پر کافی زور دیا ہے۔''

ڈاکٹر دانش حسین خان نئے لکھنے والوں میں اپنی خاصی شناخت رکھتے ہیں۔ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ تحقیق وتنقید کا ستھرا شعور رکھتے ہیں۔ شاعری سے بھی شغف ہے۔ خوب صورت نظمیں کہتے ہیں۔ علامہ اقبال کے حوالے سے ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اقبال کی شاعری میں ہندوستانی عناصر کا تنقیدی مطالعہ'' جلد ہی منصۂ شہود پر آنے والا ہے۔ موصوف نے عہدِ حاضر کی مقبول ناول نگار صادقہ نواب سحر کے مقبولِ عام ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کا تجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے ناول اور ناول نگار کا مربوط جائزہ پیش کیا ہے:

''......کہا جاتا ہے کہ کسی کام یاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ عورت جس کے پاؤں کے نیچے جنت کی بشارت دی گئی ہے وہ عورت جسے ایک دیوی کی مانند سمجھا جاتا ہے لیکن بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ جیسے جیسے حالات بدلے، سیاست بدلی، دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا کے مناظر بدل گئے اور عورت ایک حاشیے پر کھڑی ہوگئی اور آج اسی عورت کا دوسرا پہلو اور کھوٹا سکہ ہے اور اسی رخ کو پیش کرنے میں مہارت حاصل ہے ڈاکٹر نواب صادقہ سحر کو جس نے اپنے ناول کے ذریعہ خوب صورت اُسلوب، منفرد لب ولہجہ اور بہترین زبان وکردار کے ساتھ سماج کے اس حصہ کو عورت کے دوسرے رخ کو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ پیش کیا اور سماج کو باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ عورت جس کے حقوق اتنے سارے ہیں جس کے درجات بلند ہیں۔ سماج نے اس

کو کس قدر کچلا ہے۔اس مظلوم طبقے کی مظلوم عورت کی داستان کو صادقہ نواب سحر نے نہایت حسن وخوبی اور فنی مہارت کے ساتھ اپنے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' میں پیش کیا ہے۔''

ڈاکٹر تسلیم عارف کا شمار نئی نسل کے معروف ادیبوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے رانچی یونی ورسٹی سے 2015ء میں ''1980ء کے بعد اُردو افسانہ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کے مضامین ہندوستان کے معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں،''انتقادِ نظم ونثر'' کے عنوان سے تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ان دنوں یو جی سی، نئی دہلی کے پوسٹ ڈاکٹرل فیلوشپ سے وابستہ ہیں اور ''جھارکھنڈ میں نظم ونثر کے ارتقا'' پر تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف ہیں۔موصوف نام ور فکشن نگار غضنفر کے ناول ''مانجھی'' میں متھ اور حقیقت کے سنگم کے بارے میں اپنے مقالے میں فرماتے ہیں:

''یہ ناانصافی ہوگی اگر ناول کی زبان پر تبصرہ نہ کیا جائے۔جس پس منظر میں یہ ناول لکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ غضنفر نے زبان بھی اُسی پس منظر میں ڈھال دی ہے۔ کرداروں کی مناسبت سے وہ زیادہ تر خالص ہندی الفاظ کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے۔انگریزی کے الفاظ بھی جا بہ جا وی۔این۔رائے کی زبانی نقل کیے گئے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غضنفر نے اپنے عہد کی زبان کی نبض کو ناول میں پکڑنے کی کوشش کی ہے۔وی۔این۔رائے کی زبان ہمیں کہیں بھی پرائی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتی۔البتہ ویاس کی زبان سے جو گاڑھی ہندی کے لفظ ادا ہوتے ہیں وہ پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں لیکن اُس کردار کی زبان کا تقاضا یہی تھا۔اپنی شاعرانہ تربیت کا فائدہ غضنفر نے ہمیشہ اپنی نثر میں اُٹھایا ہے، 'مانجھی' میں وہ یہ موقع ہاتھوں سے کیوں جانے دیتے۔ جہاں جہاں ناول میں ضرورت پیش آئی ہے وہ نثر کے حسن کو بڑھانے کے لیے شاعرانہ ٹکڑے یا فقرے جوڑتے چلے جاتے ہیں اور قاری کو ایک فرحت بخش اور احساس سے دوچار کرانے میں کام یابی حاصل کرتے ہیں۔''

محمد غالب نشتر کا تعلق صوبۂ جھارکھنڈ کی راجدھانی رانچی سے ہے۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے ہونہار طالب علم رہے ہیں۔''1960ء کے بعد ہندوپاک کے نمائندہ افسانہ نگاروں

کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔محمد غالب نشتر کے مضامین ہندوپاک کے معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔''اُردو افسانہ: نئی جست: تنقید، تفہیم اور تعبیر'' اور ''مظہر الاسلام کا فکشن'' ان کی نمائندہ تصنیف ہیں۔ان دنوں قومی کونسل، نئی دہلی کے ایک پروجیکٹ بعنوان ''معاشرتی تشدد اور نئی صدی کا افسانہ'' پر کام کر رہے ہیں۔''اکیس ویں صدی میں پاکستان میں اُردو ناول'' کے حوالے سے اپنے مقالے میں موصوف نے کہا:

''پاکستان کے ادبی منظرنامے کا سرسری جائزہ لینے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہاں کے مسائل ہمارے یہاں کے مسائل سے بالکل مختلف ہیں۔وہاں خوف میں لپٹی ہوئی شامیں، دل کو دہلا دینے والی راتیں اور بارود میں اَٹے ہوئے دن ہیں۔پورا منظرنامہ دشتِ دہشت کا المیہ بیان کرتا ہے۔لہٰذا وہاں کے فن پاروں میں یہ تمام عناصر سمٹ آئے ہیں جن سے ہمارے یہاں کا معاشرہ اور ادب تقریباً ناپید ہے اور یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ وہاں کے ناولوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔''

شاہد اقبال واجد علی شاہ کی نگری مٹیا برج سے تعلق رکھنے والے نوجوان شاعر وادیب کی حیثیت سے اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔ان کی چار کتابیں ادب کے مختلف موضوعات پر شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔مشاعروں اور سیمیناروں میں شرکت پابندی سے کرتے رہتے ہیں۔مغربی بنگال میں اُردو ناول کے نشو ونما اور نشیب وفراز کا تذکرہ وہ اپنے مقالے ''اکیس ویں صدی میں بنگال میں اُردو ناول'' میں یوں کرتے ہیں:

''......نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' (1869ء) کی اشاعت کے تقریباً 38 برس بعد یعنی 1907ء میں مغربی بنگال میں پہلا اُردو ناول ''احسن'' بدرالزماں بدر کلکتوی نے لکھا۔اس ناول کی اشاعت کی ایک صدی گزرنے کے بعد 2007ء میں مغربی بنگال کا اب تک آخری ناول حبیب حق کا ''جسے میر کہتے ہیں صاحبو'' منصۂ شہود پر آیا۔ان 100 برسوں میں مغربی بنگال میں اُردو ناول بہت سے نشیب وفراز سے گزرا۔''

ہندوستان میں ریاست بہار کو اُردو فکشن کی راجدھانی ہونے کا فخر حاصل ہے۔اس کے تاریخی ادبی شہر ''دربھنگہ'' میں بھی اُردو فکشن پر خوب کام ہوا ہے۔ڈاکٹر منصور خوشتر کا تعلق اسی مردم

خیز خطے دربھنگہ سے ہے۔ آپ سہ ماہی اُردو رسالہ ''دربھنگہ ٹائمز'' کے مدیر ہیں اور اس کے کئی یادگار نمبر شائع کر کے عالمی سطح پر شناخت قائم کر لی ہے۔ ''افسانہ نمبر'' اور ''ناول نمبر'' کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔ منصور خوشتر شاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ ریاستی وقومی سیمیناروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں اور بہت سے انعامات واعزازات کے بھی حق دار ہوئے ہیں۔ ان کی 8 کتابیں منظرِ عام پر آ کر قبولیت کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ موصوف اپنے مقالے ''اُردو کے اہم ناولوں پر معاصر دانش وروں کی رائے کا محاکمہ'' میں فرماتے ہیں:

''اُردو ناول پر بہت لکھا گیا ہے۔ بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن معاصر اُردو ناول پر کام کم ہوا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ ناول کا مستقبل شان دار ہے کیوں کہ یہ ہماری تہذیب کا بہت بڑا عوامی آرٹ ہے اور زندگی کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی بھر پور طور پر ہوتی رہی ہے۔ ملک کا تہذیبی پس منظر بھی اس میں ہے اور اکیس ویں صدی کے مسائل اور زندگی کی تفہیم اُردو ناول کے امتیاز میں شامل ہے۔

اُردو ناول کی تفہیم بعض بیدار مغز اور توسیع پسند ذہنیت کے ناقدوں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی سچائی کے تناظر میں کی ہے۔ یہاں میں ان روشن پہلوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جن سے ارتعاش سامنے آ سکے گا۔

محمد منظر حسین مولانا آزاد کالج، کولکاتا کے شعبۂ اُردو میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ مغربی بنگال کے ادبی منظرنامے پر اُبھرنے والی نئی آوازوں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ یونی ورسٹی آف حیدرآباد کے شعبۂ اُردو سے ''لطف الرحمٰن کی تنقید: جدیدیت کی جمالیات کے تناظر میں'' کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ سپردِ قرطاس کر چکے ہیں۔ سیمینار میں پیش کیے گئے اپنے مقالے ''اکیس ویں صدی کے ناولوں میں اُردو معاشرہ'' میں انھوں نے کہا:

''ناول اور تہذیب و معاشرہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خواہ وہ ناول کسی بھی زبان، ملک، تہذیب وتمدن یا معاشرہ میں لکھا گیا ہو۔ تہذیب و معاشرہ کے بغیر ناول کا تصور بھی تقریباً ناممکن ہے۔ اُردو ناول کی تاریخ بھی اس بات کی شاہد ہے کہ یہ صنف کبھی بھی تہذیبی و معاشرتی ضرورتوں سے غافل نہیں رہی۔ ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر آج تک

کے بھی ناول نگاروں نے ان باتوں کا نہ صرف اظہار کیا ہے بلکہ اُردو ناولوں کو نئے تہذیبی ومعاشرتی ضرورتوں سے مزین کیا ہے۔ حتیٰ کہ جب جدیدیت کی تحریک بامِ عروج پر تھی اور اس وقت ہر قسم کے کمٹمنٹ اور سروکار سے انکار کیا جا رہا تھا اس وقت بھی اُردو ناول نے تہذیبی ومعاشرتی ضرورتوں سے اپنا رشتہ ہموار رکھا۔

......آج ہمیں ایک ایسے معاشرے کی ضرورت ہے جہاں ایسی نسل تیار ہو جس کے اندر مطالعہ کا شوق پیدا ہو کیوں کہ افسوس اس بات کا ہے کہ نئی نسل خواب تو بہت اونچا دیکھتی ہے لیکن اس کی تعبیر کے لیے کوشش نہیں کرتی۔ اُمید ہے کہ اکیس ویں صدی میں لکھے جانے والے ناولوں کے ذریعہ ہماری نئی نسل کی ذہنی آبیاری ہوگی تا کہ اس صدی کو نئی نسل کی صدی کے ساتھ ساتھ ناولوں کی صدی کہنے پر ہم خود کو مجبور کر سکیں۔''

عبیدالرحمٰن ہمدرد پبلک اسکول، نئی دہلی میں بہ حیثیت اُستاذِ اُردو تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ''اُردو ناول پر نوآبادیاتی اثرات: منتخب ناولوں کا تجزیہ'' (ابتدا سے 1947ء تک) کے عنوان سے ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ آخری مرحلے میں ہے۔ اپنے مقالے ''دِل من کے کرداروں کا اسطوری تفاعل'' میں موصوف یوں رقم طراز ہیں:

''اساطیر اور دیومالا کے مابین فرق نہیں ہے۔ دراصل اساطیر کے سیاق میں ایک وسیع کینوس ہمارے سامنے آتا ہے جس کے تناظر میں ہم دنیا کے مختلف اساطیری قصوں کا مطالعہ کرتے ہیں، جب کہ دیومالا کا ایک خاص سیاق ہے جو ہندوستانی اساطیر کے حوالے سے استعمال ہوتا ہے۔ یہ دراصل اُردو پر ہندی اور سنسکرت زبانوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ناول 'دل من' میں جو کرداروں کا تفاعل ہے وہ دیومالائی اور اساطیری قصوں سے سروکار رکھتا ہے۔

ناول میں جو کردار ہیں وہ زندگی کے مختلف اور متنوع تہذیبی اور جغرافیائی پس منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ اپنے عہد کی روح، دکھ، تمنا اور آرزو کا عکس ان میں موجود ہے۔ کہانی کو بیان کرنے اور آگے بڑھانے کے لیے ناول نگار نے فرضی اور تخیلی کردار گڑھے ہیں۔ موضوع کی قدامت کے پیشِ نظر ناول کی کہانی میں اساطیری اور دیومالائی عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں جس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کردار کو خلق کرنے میں اساطیر اور دیومالا کا بھی سہارا

لیناپڑا ہے۔ناول میں موجود کرداروں کی حرکیات میں ان اجزاء کوتلاش کیاجاسکتا ہے۔''

ضیا اللہ انور نئی نسل کے تازہ کار قلم کاروں میں ایک اہم نام ہے۔ممتاز شیریں کی ادبی خدمات کے حوالے سے ان کی دو کتابیں منظرِ عام پرآ چکی ہیں جنھیں قارئینِ ادب نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ان کے تنقیدی وتحقیقی مضامین ملک کے معروف جرائد میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔موصوف ریاستی وقومی سطح پر منعقد ہونے والے سیمیناروں میں بھی شرکت کرتے رہتے ہیں۔فکشن کے علاوہ انھیں لوک کلچر اور گیتوں سے بھی خاصا شغف ہے۔اس بنا پر جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی سے ''ادب میں لوک کلچر اور گیت'' پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔انھوں نے اپنے مقالے ''اکیس ویں صدی میں اُردو ناول: موضوعات و مسائل'' میں نہایت مدلل انداز میں گفتگو کرتے ہوئے کہا:

''اکیس ویں صدی میں اُردو ناول نت نئے موضوعات و مسائل سے دو چار ہے۔ Globalisation اور Consumerism کے اس دور میں جہاں فاصلے نزدیکیوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔آسائشوں کی ریل پیل ہے،انسانوں پر تکنیکیت حاوی ہوتی جارہی ہے۔انسانی زندگی جس قدر مختصر ہورہی ہے اس کے مسائل اسی قدر وسعت اختیار کررہے ہیں۔معاصر اُردو ناول کا نیا فکری نظام موجودہ صورتِ حال کو بڑی حد تک اپنے بیانیے میں سمیٹ لیتا ہے۔اس عہد میں منظرِ عام پرآنے والے ناول اگر چہ کلی طور پر روایت سے ہٹ کر نہیں مگر ہر سطح پر ان میں نمایاں تبدیلیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔بات چاہے سماجی و مذہبی اقدار کی ہو،تہذیبی و ثقافتی تشخص کی ہو، سیاسی شعور اور معاشی فکر و احساس کی ہو، انسانی رشتوں کی کشمکش کی ہو یا پھر تانیثیت اور دلت مسائل کی ہو یا نظریاتی عزم و استقلال کی۔معاصر اُردو ناول نے ان تمام موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔''

رضینہ خان کا تعلق صوبہ بہار سے ہے۔نئی خواتین قلم کاروں کی صف میں اپنی پہچان بنارہی ہیں۔جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کی قابل اسکالر ہیں۔ان کے مضامین ملک کے جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔شائستہ فاخری کے مشہور ناول ''صدائے عندلیب برشاخِ شب'' پر اپنے مقالے میں رقم طراز ہیں:

''ایک اچھے ناول کا انحصار اس کے زندہ اور متحرک کرداروں پر ہوتا ہے۔ناول

''صدائے عندلیب برشاخِ شب'' کا کینوس وسیع ہے جس وجہ سے یہاں کردار نگاری کے امکانات بھی وسیع تر ہیں۔خصوصاً جزئیات نگاری اور جذبات واحساسات کے بیان سے کردار کی داخلی وخارجی شخصیت کو اُبھارنے کی سعی نظر آتی ہے۔نسوانی کردار کے وجودی تشخص کے حوالے سے شائستہ فاخری کے ہاں مختلف انداز دکھائی دیتے ہیں۔آج نسوانی کردار نگاری ہم سے محض عورت کے سراپا،اس کی کیفیات ونفسیات کے مطالعہ کا ہی مطالبہ نہیں کررہی، بلکہ وہ اپنے انفرادی وجود کی پیش کش کا بھی اثبات چاہتی ہے۔عورت کا بڑھتا شعور تخلیقی ادب میں بہت سی تبدیلیوں کا حامل ہے۔مذکورہ ناول میں بھی ہمیں یہ تبدیلی نظر آتی ہے۔''

نورین علی حق کا تعلق بہار کے ایک علمی وادبی گھرانے سے ہے۔دہلی یونی ورسٹی،شعبۂ اُردو کے ریسرچ اسکالر ہیں۔''اکیس ویں صدی کے نمائندہ اُردو ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ'' کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ لکھ چکے ہیں۔اب ''اکیس ویں صدی کے اُردو ناولوں کا موضوعاتی، اُسلوبیاتی اور تکنیکی مطالعہ'' کے عنوان سے پی۔ایچ۔ڈی۔کا مقالہ سپردِ قلم کررہے ہیں۔اُردو فکشن پر اُن کی نظر گہری ہے۔فکشن کے علاوہ تصوف ان کا محبوب موضوع ہے۔روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' (دہلی) میں سب ایڈیٹر کے فرائض انجام دے چکے ہیں نیز روزنامہ ''انقلاب'' نئی دہلی میں ادبی صفحات کی ذمے داری بہ خوبی نبھا چکے ہیں۔فی الحال دوردرشن اُردو نیوز چینل سے وابستگی ہے۔
نورین علی حق اپنے مقالے ''ناول تنقید کا مختصر وضاحتی اشاریہ'' میں فرماتے ہیں:

''ہندو پاک دونوں ممالک اور اُردو کی نئی بستیوں میں بھی ادب کی تمام اصناف پر کام ہورہا ہے۔اگر مقدار کی بات کی جائے تو اس کا کوئی اختتام ہی نظر نہیں آتا۔ہر روز کتابیں آرہی ہیں اور معیار پر بات کا مستحق میں خود کو نہیں پاتا۔البتہ یہ بات کی جاسکتی ہے کہ اس گلوبلائزیشن کے زمانے میں بھی کتابوں کی درآمدات اور برآمدات کے وسائل و ذرائع بالخصوص ہندو پاک کے درمیان انتہائی کم زور ہیں۔ہندوستان میں پاکستانی کتابوں کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور ظاہر ہے کہ پاکستان میں بھی ہندوستانی کتابوں کے حصول کی راہیں بھی محدود ہیں ہوں گی...... میں نے ناول تنقید سے متعلق ان چند کتابوں کا تعارف کرایا ہے، جو مجھے بہ آسانی مل سکیں یا جو کتابیں میرے

پاس موجود تھیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس فہرست میں ناول تنقید کی کوئی بہت اہم کتاب نظر نہ آئے، جس کی موجودگی یہاں ناگزیر تھی۔ اس کی وجہ کچھ تو عجلت ہے اور دوسری وجہ ہماری لائبریریوں کی بے ترتیبی۔ ناول تنقید کے اس مختصر وضاحتی اشاریے میں کتابوں کے تعارف میں کسی ترتیب کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے، اس وضاحتی اشاریے پر یہ جملہ چسپاں کیا جاسکتا ہے کہ جو کتاب ہاتھ لگی اس پر بس لکھ مارا، عمر، مہارت، سنِ اشاعت اور معیار کا خیال رکھے بغیر۔ اس لیے میں مناسب محسوس کرتا ہوں کہ اس بے ترتیبی کے لیے پیشگی معذرت کرلوں تا کہ خاص طور پر ہمارے بزرگوں کی دل آزاری نہ ہو۔''

سلمان عبدالصمد کا نام مطلعِ ادب پر تیزی سے طلوع ہوا اور بہ حیثیت افسانہ نگار و ناول نگار اپنی منفرد شناخت بنالی۔ موصوف کا تعلق شہرِ ادب دربھنگہ سے ہے۔ فی الحال سلمان جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ''اُردو ناول کا اسلوبیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ ان کے تنقیدی و تحقیقی مقالے بھی اکثر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ دو کتابوں کے علاوہ ایک ناول ''لفظوں کا لہو'' بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ ان کے مقالے ''غضنفر کے فکشن کی عمومی فضا اور ''مانجھی'' میں انھوں نے ناول ''مانجھی'' میں اعتدال پسندی کے عنصر کا خصوصی جائزہ لیتے ہوئے کہا:

''ناول ''مانجھی'' میں اعتدال پسندی ہر جگہ نمایاں ہے، جو اس کی مقبولیت کی خاص ضامن ہے۔ اگر اس میں عورت مظلوم و مقہور نظر آتی ہے تو اس کی بہادری و چالاکی بھی اپنے جلوے بکھیرتی ہے، اگر اس میں عورتوں کے جسم کی نمائش کے تعلق سے مردوں کو قصوروار ٹھہرایا گیا ہے تو عورتوں کی بے راہ روی بلکہ ہر کام کے لیے اس کی......رضامندی ......کو نشانۂ تنقید بنایا گیا ہے۔ مثلاً ویاس مانجھی کی زبانی جو پہلی کہانی بیان کی گئی ہے، اس میں جہاں گھسیارے گھسیٹے رام کی بیٹی راج کماری بنتے ہی تین بڑے کام کے لیے یک دم مامور کردی جاتی ہے، وہاں ایک اعتبار سے مظلوم لگتی ہے، مگر تینوں کام کے لیے 'ہامی' بھرنا اور انہیں عملی جامہ پہنانا اس کی چالاکی اور بلند حوصلگی کی دلیل ہے اور شوہر کی اطاعت شعاری کا جذبہ بھی قابلِ تحسین ہے۔ اسی طرح اشتہارات میں جہاں عورتوں کے جسم کی نمائش کے لیے مرد ذمے دار نظر آتے ہیں اور یہ شکوہ ہوتا ہے ''اشتہاروں میں عورتوں کے

جسم کو ہی کیوں دکھایا جاتا ہے؟ کہیں کسی اشتہار میں عورت کا دماغ کیوں نہیں آتا ہے'' وہیں یہ بھی ہوتا ہے ''مگر سچ تو یہ ہے کہ اسے سونپے گئے کاموں میں یہ اس قدر منہمک دکھائی دیتی ہے کہ جیسے ان کاموں میں اس کی مرضی شامل ہو، بلکہ اس کی پسند اور خواہش کا دخل ہو، کہیں یہ بات تو نہیں کہ عورت کی سرشت میں یہ بات بٹھادی گئی ہے کہ اسے ویسا ہی کرنا ہے جیسا کہ مرد کا عندیہ چاہتا ہے۔''

◆◆◆

تعارفِ مصنف

خاندانی نام: شاعر علی

قلمی نام: شاعر علی شاعر

تخلص: شاعؔر

ولدیت: فیاض علی

تاریخ پیدائش: 20رجون 1966ء

مقام پیدائش: مدینۃ اولیاء ملتان

آبائی وطن: دہلی (انڈیا)

تعلیم: ایم اے (اُردو) ۔ ایم ایڈ

ملازمت: سرکاری

ادبی تنظیم سے وابستگی: بزمِ رنگِ ادب (بانی وصدر)

تصانیفِ نظم ونثر: 100 سے زاید کتب

ایوارڈز: 6 مختلف ایوارڈز

اصنافِ سخن: شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری، تنقید نگاری، صحافت

وجہِ شہرت: شاعری، تنقید نگاری

مدیر اعزازی: کتابی سلسلہ رنگِ ادب، کراچی

انچارج ادبی صفحہ: روزنامہ جرأت، کراچی

مینجنگ ڈائریکٹر: رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی

پتا: آفس نمبر 5- کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

ای میل: rangeadab@yahoo.com

موبائل فون نمبر: 0336-2085325 ۔ 0345-2610434

فیس بک: www.facebook.com/rangeadab

◆◆◆